مولانا مسعودی نم

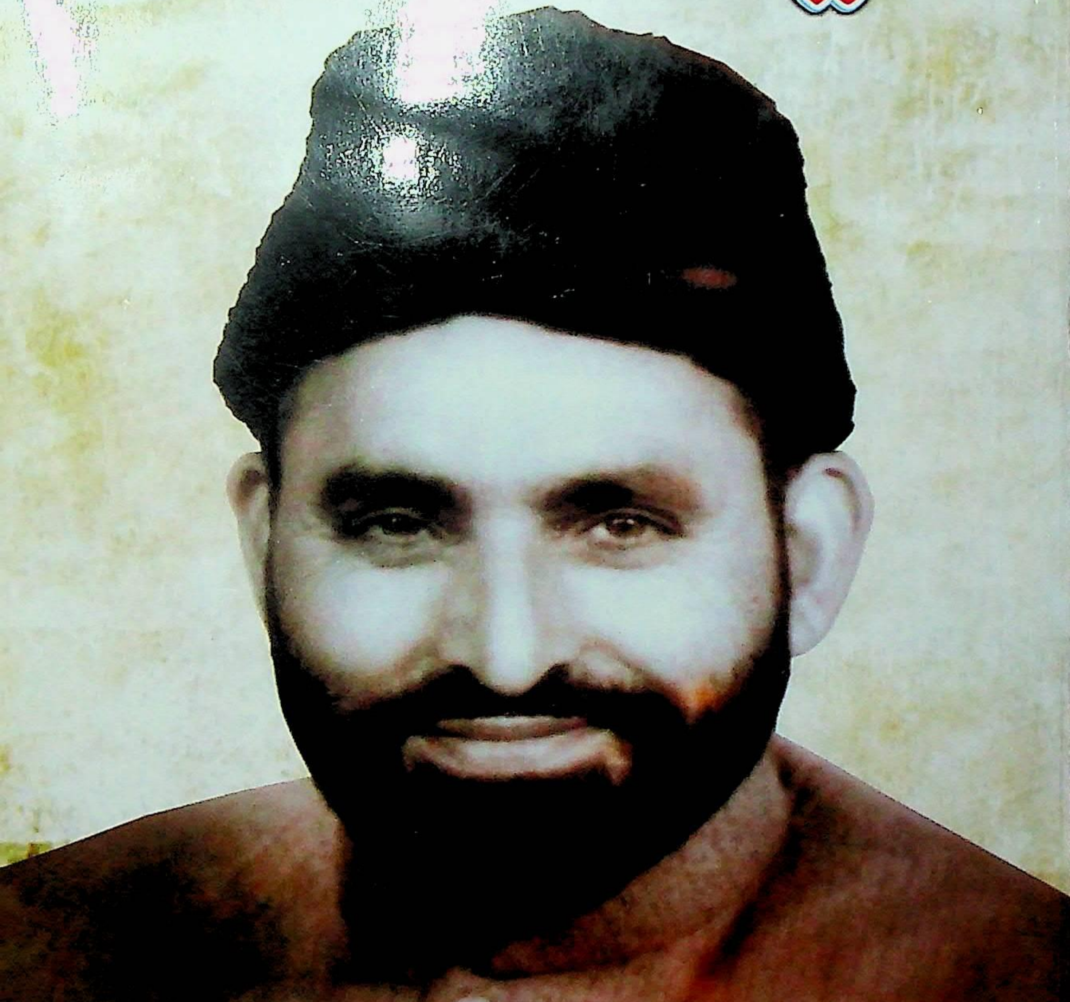
شیرازہ



جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

مولانا مسعودی نمبر

شیرازہ



جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد:۵۵ مولانا مسعودی نمبر نمبر:۱

نِگراں : ڈاکٹر عزیز حاجنی

مُدیرِ اعلیٰ : محمد اشرف ٹاک

مدیر : محمد سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپیوٹر کمپوزنگ/سرورق: مِڈ کیپ پبلیشرز، کرن نگر، سرینگر
قیمت : ۳۰/روپے

''شیرازہ'' میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کُلّاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

(ادارہ)

☆......خط وکتابت کا پتہ:
مدیر ''شیرازہ'' اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر/جموں
ای میل:sheeraza2015@gmail.com
salimsalik2012@gmail.com
فون نمبر:9419711330, 9419072288

فہرست

☆☆☆

حرفِ آغاز

اکیڈیمی کی آئینی ذمہ داریوں میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ شامل ہے کہ وہ ایسی شخصیات پر خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کرے جنہوں نے ریاست کے علمی، ادبی، ثقافتی اور تواریخی منظرنامے پر گہرے اثرات مرتب کئے ہوں۔ اکیڈیمی کے قیام کی گزشتہ چھ دہائیوں کے دوران ایسی گوناگوں اشاعتیں منظرِ عام پر آکر مختلف حلقوں سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آج ریاست کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت مفکرِ کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی پر زیرِ نظر اشاعت آپ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے ہم ایک بڑی اور اہم ذمہ داری سے سبکبار ہو رہے ہیں۔ مولانا موصوف کئی دہائیوں تک ریاست کے علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی منظرنامے پر چھائے رہے۔ آپ بنیاد کا وہ پتھر تھے جس پر وقت کے زیرکوں نے بڑے قصر تعمیر کئے۔ مولانا کی ذات سے اختلاف رکھنے والے بھی اُن کی شرافت، وسعتِ قلبی، تبحر علم، لیاقت اور دیگر صفات کے معترف رہے ہیں۔ آپ کی ذات مختلف اوصاف کا مجموعہ تھی اور اکثر اصحابِ فکر و نظر کا ماننا ہے کہ اگر وہ علم و ادب کی طرف پوری توجہ کرتے اور اپنی تحریریں سنبھال کے رکھتے تو آج اُن کا شمار ریاست کیا، ملک کے مقتدر ادیبوں میں ہوتا لیکن اُن کی درویشانہ طبیعت ان سب چیزوں سے جیسے بے نیاز تھی۔ ملک کی سرکردہ شخصیتوں جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، سیماب اکبرآبادی، مولانا ظفر علی خان وغیرہ کے ساتھ اُن کے ذاتی مراسم تھے اور اُن کو مولانا کے قد و قامت کا پورا پورا اندازہ تھا۔

مولانا پر شیرازہ کی اشاعتِ خصوصی کا اہتمام ہمارا ایک دیرینہ خواب تھا اور اس سلسلے میں دفتری لوازمات بہت پہلے مکمل کر لئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں ہم نے اُن کے بعض ساتھیوں اور دیگر اکابرین سے باضابطہ طور درخواست بھی کی لیکن اکثر حضرات وعدۂ فردا ہی سے کام چلاتے رہے جو کبھی پورا نہیں ہوئے۔ ایک اور مشکل یہ تھی کہ مولانا کے اس دُنیا سے چلے جانے کے ساتھ ہی اُن کا بچا کھچا کتب خانہ اور تحریریں افراتفری کی نذر ہو کر وقت کی آندھی میں کھو گئے۔ ایسے میں خانوادۂ مسعودی کے چشم و چراغ رشید احمد مسعودی نے ہمارا ہاتھ تھاما اور اُن کی کوششوں کی بدولت ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ حق تو یہ ہے کہ زیرِ نظر اشاعتِ خصوصی مولانا کی ہمہ پہلو شخصیت کا بھرپور احاطہ کرنے سے قاصر نظر آتی ہے لیکن جو کچھ دستیاب ہو سکا وہ نذرِ قارئین ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ سلسلے کی ابتداء ہوگئی ہے اور اس کو آگے لے جانے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔

ادارہ' اُن تمام مضمون نگاروں کا مشکور ہے جنہوں نے ہماری گزارشات کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے ہمیں اپنی نگارشات ارسال کیں۔ کہیں کہیں ہم نے بعض اخبارات میں شامل مضامین اور تراشے بھی اُن کی افادیت کے پیشِ نظر زیرِ نظر شمارے میں شامل کئے ہیں۔ اکیڈیمی کے اردو شعبے کے اراکین نے حسبِ روایت اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے یہ اہم ذمہ داری انجام دی جس کے لئے وہ شاباشی کے مستحق ہیں۔

اُمید ہے کہ قارئین کو ہماری یہ کوشش پسند آئے گی جس کے لئے ہمیں اُن کی آراء کا انتظار رہے گا

ہم بھی تو خاکِ رہِ صاحبِ نظراں ہیں اے دوست

محمد اشرف ٹاک

☆☆☆

☆......مولانا محمد سعید مسعودی

ترانہ......لہرا اے کشمیر کے جھنڈے

لہرا اے کشمیر کے جھنڈے طفل و جوان و پیر کے جھنڈے
بازوئے بے شمشیر کے جھنڈے ہل والے دِل گیر کے جھنڈے

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا
تا بہ قیامت پیہم لہرا

میدان اور جبل پر لہرا ولر پہ لہرا، ڈل پر لہرا
کٹیا اور محل پر لہرا خشکی اور جل تھل پر لہرا

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا
تا بہ قیامت پیہم لہرا

بال و پر پھیلا کر لہرا ساری فضا پر چھا کر لہرا
شوق سے وجد میں آکر لہرا جھوم کے اور بَل کھا کر لہرا

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا
تا بہ قیامت پیہم لہرا

تُو ہے ہماری آنکھ کا تارا مظلوموں کے دِل کا سہارا
رنگ تیرا ہے لال دُلارا ہل کا نشان ہے پیارا پیارا

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا
تا بہ قیامت پیہم لہرا

تُو ہی نشانِ مہر و وفا ہے آئینہ دارِ صدق و صفا ہے
مشعلِ نور افشا بہ فضا ہے سایۂ رحمت، بالِ ہُما ہے

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا
تا بہ قیامت پیہم لہرا

☆☆☆

☆......محمد یوسف ٹینگ

مولانا مسعودی......ایک درویش صفت شخصیت

تحریکِ کشمیر، بعض اسے تحریکِ حریت اور بعض تحریکِ آزادی کہہ کر یاد کرتے ہیں، کے رہنماؤں کے بڑے جڑاؤ ہار کے آخری نگینے مولانا محمد سعید مسعودی نے، ان سب میں لمبی عمر پائی۔ ۱۹۳۱ء میں کشمیر کے اُفق پر نمودار ہونے والے اس ستارے کا غروب ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو ہوا اور وہ بھی اس انداز سے کہ اب اُن کی آخری آرام گاہ کا نشان بھی موجود نہیں ہے۔

در سینہ ہائے مردم عارف مزارِ ما

مولانا سعید کی اپنی گفتار کے مطابق جو اُنہوں نے مجھ سے کی، وہ پچھلی صدی کے پہلے برس یعنی ۱۹۰۰ء میں شمالی کشمیر کے پہاڑی علاقے لواط میں پیدا ہوئے اور ایک بہت ممتاز علمی خاندان میں۔ اُن کی مسعودی نسبت سرینگر میں آسودہ خواجہ مسعود نروری کے خاندان سے ہے۔ یہ بقعہ سرینگر کے ڈاؤن ٹاؤن میں مرجع خلائق رہتا آیا ہے۔ (مسعودی نسبت کے دوسری بزرگ خواجہ مسعود پانپوری، جنوبی کشمیر کے پانپور قصبے میں آسودہ ہیں) محمد سعید کا خاندان وہی ہے، جس میں کشمیر کے مشہور و معروف سکالر اور محدث مولانا انور صاحب لولابی المعروف الانور بھی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ وہی مولانا انور ہیں جنہوں نے پہلے دارالعلوم دیوبند میں اپنی ذہانت، فطانت اور فصاحت کی دھاک بٹھا دی اور پھر وہاں سے الگ ہو کر ڈابیل نامی قصبے میں اپنا الگ دارالعلوم قائم کیا۔ مولانا صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے خاندان کے علماء و فضلاء سے حاصل کی اور

بعد میں مزید اور رسمی تعلیم کے لئے لاہور کا رُخ کیا۔ وہاں اُنہوں نے عربی، فارسی اور اُردو کا درس لیا۔ یہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کی بات ہے۔ اُن دنوں لاہور علمی، فکری اور عملی ہیجان اور ہلچل کا مرکز تھا۔ علامہ اقبال کی آنکھیں کھلی تھیں۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری، مولانا فضل الحق اور مولانا ظفر علی خان فصاحت، بلاغت اور صحافت کے دریا بہا رہے تھے۔ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر اخبار ''انقلاب'' کے پلیٹ فارم سے قلم کے الاؤ جلا رہے تھے۔ حمید نظامی ''نوائے وقت'' اور مولانا ظفر علی خان ''زمیندار'' میں شعلہ افگن تھے۔ مسلم مخالف آوازوں میں روزنامہ ''مِلاپ'' کے مہاشہ خوشحال چند اور روزنامہ ''پرتاپ'' کے مہاشہ کرشن انگارے برسا رہے تھے اور یہ سب کچھ اُردو زبان میں ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں سیاسی محاذ پر لالہ لاجپت رائے، مولانا داؤد غزنوی، سر فضل حسین جیسے لوگوں کا طوطی بول رہا تھا۔ مولانا سعید رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس روشن الاؤ سے بھی انگارے چن رہے تھے۔ وہ اُن خوش قسمت کشمیریوں میں ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کے آخری برسوں میں اُن کی طویل اور جان لیوا علالت کے دوران اُن کی محفلوں میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی بلکہ اُن کو کشمیر کے بارے میں تازہ حالات و واقعات کی خبریں بھی پہنچاتے رہے۔ میری حقیر معلومات کے مطابق اگرچہ کچھ اور کشمیری بھی اُس وقت علامہ کی محفلوں میں کبھی کبھار جاتے رہے اور بعد میں بڑے مشہور ہوئے جیسے شیخ محمد عبداللہ، عبدالستار رنجور، مرزا عارف اور سید محمد احمد علی شاہ...... لیکن سب سے زیادہ وقت گزاری کا سرمایہ مولانا سعید صاحب کے ہاتھ ہی آیا اور اُن ہی کی ذات نے علامہ کے علمی چراغ سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔

مولوی صاحب ۱۹۲۹ء کے قریب کشمیر لوٹے تو اُنہوں نے خانیار کے سکول میں مدرس کی ملازمت حاصل کر لی اور بعد میں ایس پی کالج میں فارسی کے لیکچرر بنے۔ اُن کا بیان ہے کہ اُن دنوں سرینگر میں اُن کی جان پہچان بہت کم تھی اور اس لئے وہ قیام

وطعام کے بارے میں کافی سرگرداں رہے۔اُن کے بیان کے مطابق اُن دنوں سرینگر میں بھی ذہنوں میں تلاطم اپنے گرداب بپا کررہے تھے اور کشمیری لوگوں کی مظلومیت کا پردہ چاک ہورہا تھا۔ نئے مہاراجہ ہری سنگھ پہلے ڈوگرہ حکمران تھے جو ولایت سے پڑھ کرآئے تھے اور تازہ افکار سے آراستہ تھے لیکن یہاں زمین پر اُن کی نہیں بلکہ اُن کے اہلکاروں اور افسروں کی زیادہ پکڑ تھی۔ خود ہری سنگھ نے ایک روشن خیال بنگالی برہموسرابین بینرجی کو اپنا سینئر منسٹر مقرر کیا۔لیکن جلد ہی اُس کی یہاں کی مستحکم نوکرشاہی سے ٹھن گئی۔اُنہوں نے استعفیٰ دے دیا اور اپنا مشہور زمانہ بیان جاری کیا کہ کشمیریوں کو گونگے اور بہرے مویشیوں کی طرح ہانکا جارہا ہے اور اُن پر مظالم کی یورش ہورہی ہے۔مولانا کے بیان کے مطابق اُن دنوں ایک طرف پنڈت پریم ناتھ بزاز اور پنڈت شیونرائن فوطیدار کی سربراہی میں پنڈت پنجابی مسلمانوں کے کشمیر میں عمل دخل پر غُل مچارہے تھے۔لیکن غلامی کی لمبی نیسر[1] (Slumber) سے آہستہ آہستہ جاگ جانے والے مسلمانوں کے ذہن بھی نئی کروٹیں لے رہے تھے۔مولانا کے بیان کے مطابق خانیار کے مشہور گیلانی خاندان کا دیوان خانہ اور وہیں رہنے والے سعدالدین شال کی کوٹھی اس کھسرپسر کے مرکز بن رہے تھے۔ کسی طرح سے مولانا سعید کی شُستہ اور شائستہ گفتاری کی بھنک سادات گیلانیہ کے معاصر سرخیل میر محمد مقبول کے کان میں بھی پڑی۔گیلانی صاحب ایک جاگیردار اور آستانۂ گیلانیہ کے بڑے مجاور کی حیثیت سے بڑے صاحبِ حشم اور اقتدار والے تھے۔اُن کے دیوان خانے پر ہر روز سوالیوں موالیوں کا انبوہ نظر آتا تھا

بہ درِ اہلِ کرم شود گدامے زیبد

---

[1] نیسر: کشمیری لفظ۔نہایت گہری، کمبھ کرن جیسی نیند۔میری دانست میں اس کے زور کا کوئی لفظ اُردو میں موجود نہیں ہے۔

وہ جب کہیں مریدوں کے اصرار پر شادیوں وغیرہ کے لئے گھر سے نکلتے تو اُنہیں دِلی کے عہد مغلیہ کے امراو وزراء کی طرح عماری میں زیبِ دوش کیا جاتا۔ وہ بڑے دستِ سخا کے مالک بھی تھے اور بہت خوش مزاج، زندہ دل بھی۔ وہ بھی دھیمے سروں میں مسلمان رعیت کی حالتِ زار پر بے زار اور بیمار نظر آتے تھے۔ اُنہوں نے مولوی صاحب کو اپنے ہی سخاوت منزل میں رہنے پر آمادہ کیا اور وہیں پر اُن کے دل میں ایسی اُمنگ پیدا ہوئی کہ اُنہوں نے ملازمت کے طوق غلامی کو نکال پھینکا اور جذبۂ آزادی کی اُٹھتی ہوئی موج پر سوار ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء کے ابتدائی مہینوں میں شہر میں نئی صبح کی شفق فضاؤں کو دہکا اور لہکا رہی تھی، دلوں میں دبی ہوئی آرزوؤں کی آوازیں صورِ اسرافیل کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔ ایک تیز طرار تقریر کے بعد مولانا کو گرفتار کر کے سنٹرل جیل میں پہنچا دیا گیا۔ اس دوران سرینگر میں ۱۳؍ جولائی ۱۹۳۱ء کا شعلہ بھڑکا۔ بائیس کشمیری نوجوانوں کے سینوں کو شخصی سرکار کے بندوق برداروں نے چھلنی کر دیا لیکن ان سرچشموں سے جو لال دھارائیں بہہ نکلیں اُن کی تابانی سے کشمیر میں صدیوں کی غلامی کی ظلمت تار تار ہوگئی۔ کشمیر کی بیداری کی وہ شفق پھولی جو آج پون صدی کے بعد بھی دشت و دمن کو دہکا رہی ہے۔

بہارِ لالہ و گُل، شوخیِ برق و شرر بن کر
وہ آئے سامنے میرے حجاباتِ نظر بن کر

مسعودی صاحب اس تیز دھارے کے ساتھ سرینگر کے سنٹرل جیل پہنچا دیئے گئے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ ایک دن جب وہ ایک قیدی کی حیثیت سے صحنِ زندان کے اکلوتے نلکے کے پاس پانی کی جستجو کر رہے تھے تو وہ دراز قامت شخص اُن کے سامنے سے گزرا جس کو تاریخ کی پُر اسرار قوتوں نے اس اُبھرتے ہوئے ہنگامۂ نشور کی قیادت کے لئے چُنا تھا۔ وہیں دونوں کی ملاقات ہوئی اور پھر ایسے ۵۱ ؍سالہ تعلقات کا

پیش خیمہ ثابت ہوئی جس میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ مگر جس کے انجام پر ستمبر ۱۹۸۲ء میں مولانا صاحب نے شیخ صاحب کو خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے اپنی فصاحت اور بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے کہا کہ کشمیری آنے والے پانچ سو برس تک اس رہنما کی نظیر پیدا نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد مولانا کا قد تحریک میں اونچا ہونے لگا۔ وہ اس کی دل نشین ترجمانی کے لئے زبان کے علاوہ قلم سے بھی ذہنوں کو سینچتے رہتے۔ ۱۹۳۹ء میں جب مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا تو پتھر مسجد میں منعقدہ اس کنونشن کا خطبۂ استقبالیہ مولوی صاحب نے پیش کیا۔ اسی کنونشن میں رئیس الاحرار چوہدری غلام عباس نے مولوی صاحب کو بس ایک بار تقریر کی خوبی میں پچھاڑ دیا اور کہا کہ جس طرح بالغ ہوتے ہوئے نومولود کے لئے پرانے اور تنگ کپڑوں کی بجائے کھلے اور بڑے پہناوؤں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اب جموں و کشمیر کی تحریک مسلم کانفرنس کی تنگ نائے میں سما نہیں سکتی بلکہ اس کے لئے ہمیں بڑی لمبائی چوڑائی کی پوشاک تیار کرنا ہو گی۔ اس واقعے کے ایک سال بعد نئی جماعت کا پہلا باقاعدہ سیشن بارہمولہ میں منعقد ہوا۔ اُس سیشن کی صدارت کے لئے سردار بدھ سنگھ کو چُن لیا گیا تھا اور مولانا اُس وقت جماعت کے جنرل سیکریٹری بن چکے تھے۔ اُنہوں نے راقم سے کہا کہ اُس وقت نئی تنظیم کے پرچم کا خاکہ تیار کیا جا چکا تھا...... خون کے رنگ کے سُرخ کپڑے پر ہل کا نشان...... کشمیر کے مظلوم محنت کش کسانوں کی لہولہان جدوجہد سے لالہ زار پارچے پر ہل۔ کسانوں کی زمین سے گفتگو کے لاؤڈ سپیکر کا سمبل۔ کمال یہ ہے کہ پانچ ہزار سال قبل جب کشمیر کا فرمانروا مہابھارت کی جنگ میں حصہ لینے کے لئے اپنے عسکری دستے کے ساتھ روانہ ہوا تھا تو اُس کے پھریرے پر بھی یہی نشان لہرا رہا تھا اور یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ جہاں بھارت کا غالب طبقہ پانڈوؤں کے ارجن کی فوجوں کی پُشت پناہی کر

رہا تھا وہاں کشمیری اُن کے مخالف کوروؤں کو کُمک پہنچانے کے لئے دوڑ رہے تھے۔
لیکن ۱۹۴۰ء میں اصل اثر سوویت یونین کے پرچم سے آیا تھا۔ لال زمین پر درانتی اور ہتھوڑے کا نشان جو مزدور کی علامت تھا اور ہمارا ہل کسان کی۔ بہر حال، اب اس موقعے پر پرچم کشائی انجام دینی تھی۔ اس کا ترانہ کون لکھے۔ مسعودی صاحب کے مطابق اُنہوں نے سرینگر اور بارہمولہ کے سفر کے دوران اس کو مکمل کر دیا۔

اس کو سازوں کی موج پر پیش کیا گیا تو سارا جلسہ جھوم اُٹھا...... آج یہ لال جھنڈا اگرچہ تین عمودی لکیروں کے ساتھ سیکریٹریٹ پر بل کھا کے لہراتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس کا ترجمان ترانہ خاموش ہو گیا ہے۔ اس کی ترنم ریز لحن کو خاموش کر کے تحریک کو چُپ کی مُہر لگا دی گئی ہے۔ میری دانست میں اس کو شاید آخری بار ۱۹۸۱ء کے حضوری باغ کے اُس جلسے کے پلیٹ فارم سے آرکسٹرا اور بینڈ کے ساتھ پیش کیا گیا تھا جب شیخ محمد عبداللہ صاحب نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنی تنظیمی جانشینی کا خلعتِ فاخرہ عطا کیا۔

☆☆☆

مولانا مسعودی نیشنل کانفرنس کے سیاسی اور اقتصادی منصوبے "نیا کشمیر" سے بھی گہرے طور وابستہ رہے اور اُن کی ہی جمع کی ہوئی عوامی عرضداشتوں کے مطالعے کے بعد ہی پی ایل بیدی اور کچھ اشتراکی خیال کے دانشوروں نے "نیا کشمیر" کا پہلا مسودہ تحریر کیا۔ اُنہوں نے اصل دستاویز کو انگریزی میں لکھا تھا۔ لیکن مولانا مسعودی نے اس کا تن تنہا اُردو میں ترجمہ کیا۔ (کمال یہ ہے کہ اُن کے ہاتھ کا مسودہ اب بھی اصل حالت میں کتاب کے پہلے ایڈیشن کے خوشنویس پیر محمد افضل مخدومی کے فرزند جاوید مخدومی کے پاس سالم حالت میں موجود ہے جس پر کہیں کہیں شیخ صاحب کے ہاتھ سے تصحیح کے حروف لال روشنائی میں نظر آتے ہیں)۔ مولانا مسعودی نے نیشنل کانفرنس کی تاریخ کے شاید سب سے زیادہ واقعات ساز سالانہ اجلاس میں بھی بہت اہم

رول نبھایا جو ۱۹۴۵ء میں سوپور میں منعقد ہوا۔ اُس وقت محمد علی جناح صاحب کشمیر کے دورے پر تھے اور شیخ صاحب نے اب اپنے حتمی دوست چُن لئے تھے۔ اس اجلاس میں جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، خان عبدالغفار خان، عبدالصمد خان وغیرہ نے شرکت کی اور ''نیا کشمیر'' کے منصوبے کو باقاعدہ منظوری دی گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ الحاقِ ہند کا پہلا تانا بانا اسی اجلاس میں پھیلایا گیا۔ لیکن اُدھر عالمی اور برصغیر کی سطح پر بہت ہی عواقب خیز واقعات رونما ہو رہے تھے جن کا عکس کشمیر پر براہِ راست پڑ رہا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ہی دوسری عالمگیر جنگ میں اتحادیوں نے اڈولف ہٹلر کو ہرا کر فیصلہ کُن فتح حاصل کر لی اور برطانیہ اس جنگ سے اتنا خستہ و خراب ہو کر نکلا کہ اب ہندوستان کو تھامے رکھنا اُس کے لئے دیوانے کا خواب بن گیا تھا۔ برطانوی تاریخ کے عظیم مُدبّر اور برطانوی سامراج کے علمبردار ونسٹن چرچل نے عالمی جنگ میں جیت کے باوجود الیکشن ہارا۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ اس کے بٹوارے کے اُفق بھی روشن ہونے لگے۔ پاکستان کے قیام کے امکانات نے کشمیر کی رائے عامہ میں تلاطم پیدا کیا اور نیشنل کانفرنس ایک زبردست Existential خطرے سے دوچار ہوگئی۔ شیخ صاحب نے یہ ماجرا دیکھا تو اس نے نئی لہر کا سامنا کرنے کے لئے ''بعینامہ امرتسر توڑ دو، کشمیر چھوڑ دو'' کی ڈھال سنبھال لی۔ واقعاتی طور پر کشمیر میں ۱۸۴۶ء کے بعینامہ امرتسر جو بقول موہن داس کرم چند گاندھی کشمیر کے بکری پتر کے سوا کچھ اور نہ تھا، کی عمر سو سال کی ہو رہی تھی اور کوئی بعینامہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا۔ شیخ صاحب نے سرینگر کے چند جلسوں میں محی الدین قرہ کے ساتھ مل کر بڑی جوش انگیز اور جذبات سے لبریز تقریریں کیں۔ اُنہیں ۲۰ مئی کو جب وہ ہندوستان میں جواہر لال نہرو اور دوسرے دوستوں کے ساتھ مشورہ کرنے کے لئے جا رہے تھے، گڑھی دوہٹہ کے مقام پر گرفتار کر کے بغاوت کے مقدمے میں ماخوذ کر لیا گیا۔ مولانا مسعودی کے مطابق شیخ صاحب کا یہ فیصلہ اُن کی ذاتی اُپج تھی اور اس

کے لئے اُنہوں نے جماعت کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بُلانا تو درکنار انفرادی رفیقوں کی بھی رائے نہیں لی تھی۔ مسعودی صاحب کے بقول یہ ایک زبردست غلطی تھی۔ اُس وقت جب کہ برصغیر میں برطانوی سامراج کے ساتھ اس کے وفادار ریاستی حکمران بھی دم توڑ رہے تھے تو کشمیری کی تحریکِ آزادی کے لیڈروں کو باہر رہ کر آزادی کے ساتھ عوامل وعواقب کا معاملہ کرنے کے بعد اپنی راہِ عمل سنوارنی چاہیے تھی لیکن وہ جیلوں کی دیواروں کے پیچھے واقعات کے آکسیجن اور کارفرمائی کے کرتبوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جس کا خمیازہ کشمیر آج بھی اُٹھا رہا ہے۔

لیکن اس کے باوجود وہ بڑے دھارے سے الگ رہنے کے لئے روادار نہیں تھے۔ اگرچہ پارٹی کے دو اہم قائدین بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق آنکھ بچا کر لاہور میں پناہ گزین ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن شیخ صاحب کے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ نیشنل کانفرنس کارکنوں کو پکڑ لیا گیا، گولیوں سے درجنوں کشمیری مارے گئے، لاٹھی چارج، عذاب وعتاب وغیرہ کے حربے آزمائے گئے اور مہینہ بھر میں تحریک کو کچلنے میں کامیابی حاصل کر لی گئی۔

مولوی صاحب اپنے بہت سے رفیقوں کے ساتھ سنٹرل جیل میں محبوس تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اُنہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر جیل میں ہونے والے مظالم اور دوسرے معاملات کو اُٹھا کر بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ خود مولوی صاحب کوئی ۴۵ر دن تک بھوکے رہے اور اُن کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ یہ اطلاعات باہر آنے لگیں تو بے چینی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ حکومت زِچ ہو گئی لیکن اندر اندر سے کھچڑی پک رہی تھی تو اُس کے زیرِ اثر بھوک ہڑتال ختم کر دی گئی۔ ۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو شیخ صاحب کو سرینگر کی بادامی باغ چھاونی سے اُن کے گھر صورہ پہنچا کر رہا کر دیا گیا۔ مولوی صاحب اُن کے کوئی ایک ہفتے کے بعد جیل سے باہر آ سکے۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو

قبائیلی حملہ، ہندوستان سے الحاق اور ہندوستانی فوج کی آمد کے ساتھ کشمیر عالمی سطح پر ایک ہیجان انگیز خبر کے طور پر اُبھر آیا۔ مولانا نے راقم سے ایک ذاتی ملاقات میں کہا کہ جب ۲۷/اکتوبر کی صبح کو ہندوستانی فوج کو لے کر ہوائی جہاز سرینگر پہنچنے لگے تو اُنہیں ہوائی اڈے پر اُترنے سے پہلے سرینگر بلکہ وادی کے نواحی علاقوں کے اُوپر سے گشت کرنے کی صلاح دی گئی تاکہ وادی کے لوگوں کو قبائیلوں کی آمد سے جو ڈر لگنے لگا تھا اُس کی تلافی کی جائے اور اُن کے حوصلوں کو پھر اُبھارا جائے۔ مولانا صاحب کا وہ مشہور جُملہ اس ساری صورت حال کے مطابق اُس وقت کی خوف زدہ لیڈر شپ کی ذہنی کیفیت کا احاطہ کرتا ہے جس کے مطابق اُنہوں نے ان طیاروں کو طیر اُابابیل، پُکارا تھا۔ بہر حال، جب مہاراجہ ہری سنگھ صدی بھر کا خزانہ گاڑیوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ ۲۵/اکتوبر ۱۹۴۷ء کی رات کو جموں کی طرف نکل گیا تو کشمیر میں ایک ایمرجنسی ایڈمنسٹریشن کے حوالے اقتدار کیا گیا اور اُس میں مولانا کے سپرد کرناہ کیرن کا وہ علاقہ کیا گیا تھا جہاں سے وہ کشمیر آئے تھے۔ اُن کے کئی قرابت دار وہاں کام بھی آئے۔ لیکن اُنہوں نے معاملات کو کسی حد تک ٹھیک رکھنے میں اپنا رول بخوبی ادا کر دیا۔

اس مرحلے پر مجھے اُن سے کی گئی ایک اور گفتگو یاد آتی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ قبائیلوں کو کشمیر حاصل کرنے میں اس لئے ناکامی ہوئی کہ اُنہوں نے تین چار بہت ہی اہم دن بارہمولہ وغیرہ میں ضائع کر دیئے۔ اگر اُنہوں نے پہلے ہی سرینگر کے ہوائی اڈے پر قبضہ کیا ہوتا تو اُن کو وہاں سے اُکھاڑنا مشکل ثابت ہوتا۔ دوسرے یہ کہ پاکستانی حکمرانوں کو کشمیر کی بجائے سیالکوٹ سے جموں میں داخل ہونا چاہیئے تھا۔ چند میل کی دوری آسانی سے طے کی جا سکتی تھی اور پھر جموں سرینگر شاہراہ پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد ہندوستانی فوج کو کمک ملنے میں پریشانیاں رہتیں اور سب سے بڑھ کر اس طرح سے وہ لاکھوں مسلمان قتل ہونے سے بچائے جا سکتے تھے جنہیں ۷/نومبر اور

اُس کے بعد شکار بنایا گیا۔ جموں سے مسلم آبادی کا بڑا حصہ بھی سرحد پار کر کے نہیں چلا جاتا اور وہاں کی آبادی کا تناسب بھی بحال رہتا۔

مولانا مسعودی اُن چھ ارکان میں شامل تھے جنہیں ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کی رکنیت کے لئے چن لیا گیا بلکہ وہ ریاستی آئین ساز اسمبلی کے پہلے دن کی کاروائی کے Protem پریذیڈنٹ بھی مقرر ہوئے جس میں جی ایم صادق کو اس کا باقاعدہ صدر نشین بنایا گیا۔ دلی کی آئین ساز اسمبلی میں اُنہوں نے اپنی شیریں بیانی سے توجہ حاصل کی۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ کشمیر کے متعلق ایک بحث کے دوران شیاما پرشاد مکرجی نے ایک زور دار تقریر کی جس میں نیشنل کانفرنس کے موقف کو نشانہ بنایا۔ مولانا کا کہنا ہے کہ جب میں اس کا جواب دینے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تو میری تقریر کے دوران بہت سے ممبران شور مچاتے رہے اور صدر نشین ڈاکٹر راجندر پرشاد سے مجھے بیٹھ جانے کی تلقین کرنے کا مطالبہ کرنے لگے لیکن اُنہوں نے مجھے اپنی تقریر مکمل کرنے کی اجازت دی اور جب لابی میں سُستانے کے لئے پہنچا تو شیام پرشاد مکرجی میرے پاس آئے، مجھے گلے لگا لیا اور کہا کہ آپ کی تقریر اتنی عمدہ اور دلپذیر تھی کہ اختلاف کے باوجود میں اس پر عش عش کر اُٹھا۔ بعد میں مولوی صاحب ۱۹۵۲ء میں ہندوستان کی پارلیمنٹ کے لئے بھی چُنے گئے۔ اسی دوران ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کا سانحہ پیش آیا۔ بعد میں شیخ محمد عبداللہ نے کہا کہ مولانا نے اس سانحے کے بارے میں کیوں پُر اسرار خاموشی اختیار کی تھی ۔ مولانا کا کہنا تھا کہ ''میری خاموشی ہی میرا احتجاج تھا''۔ بات مختصر کرتے کرتے بہت مکرّر ہو گئی ہے۔ میرا منڈیٹ یا مطلب قاری کو داستان جیسی طولانیوں میں جکڑنا نہیں ہے۔ لہٰذا چند بہت نمایاں باتوں کو چھیڑ کر میں مقطع پر آجانا چاہتا ہوں۔ مولانا کو شیخ صاحب کی نظر بندی بھی راس نہیں آئی اور اُنہیں بھی آخر کار زندانی بن کر حضرت بل قتل کیس میں ماخوذ کر لیا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ اُس ڈیلی

کیشن کے ایک رکن تھے جو شیخ صاحب کی قیادت میں پاکستان گیا اور کوئی بات سلجھائے بغیر ۲۷ رمئی ۱۹۶۴ء کو نہرو جی کی موت کے بعد خالی ہاتھ دلی واپس آیا۔ بعد میں ۱۹۶۵ء میں دراندازی کے وقت وہ پھر جیل گئے اور ہوتے ہوتے ۱۹۷۷ء میں ہندوستان کی جنتا پارٹی کی کشمیر شاخ کے صدر بنا دیئے گئے لیکن مرار جی ڈیسائی کی دوستی بھی اُنہیں راس نہ آئی کہ ۱۹۷۷ء میں شیخ صاحب کی جماعت نے الیکشن میں اُن کی جماعت کو کڑی شکست دی۔ مولانا ہوتے ہوتے پھر گاندربل میں عزلت نشین ہو گئے۔ کشمیر میں ملی ٹینسی کا دور دورہ شروع ہوا تو وہ گاندربل میں ہی ضعفِ پیری کے ساتھ ضعفِ گردہ کے عوارض میں مبتلا تھے۔ اُن کے بڑے ساتھی شیخ صاحب، بیگ صاحب، بخشی صاحب، صادق صاحب اپنی عاقبت کو روانہ ہو چکے تھے۔ مولانا نے سیکورٹی لینے یا گاندربل سے دور جانے سے انکار کر دیا۔ آخر کار وہ گھڑی آن پہنچی جب ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو اُن کا قاتل اُن کے کمرے تک پہنچ گیا اور اس نے ایک گولی اُن کے حلق میں پیوست کر کے اُنہیں اُن کے ابدی سفر پر روانہ کر دیا۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

مولانا کشمیر کے پہاڑی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے کشمیری زبان سمجھ تو سکتے تھے لیکن بولنے میں اُن کا لہجہ اُن کی بے بضاعتی کی گھنٹی بجاتا تھا۔ اگر وہ کشمیری بول سکتے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کشمیر کی تحریکِ آزادی کے پہلے مقام کے بھی دعویدار بن سکتے تھے۔ اُنہیں بے شمار اُردو اور فارسی شعر یاد تھے اور اُردو کے کلاسیکی ادب سے واقف تھے۔ اُنہوں نے کشمیر کی جن بڑی شخصیات کے عروج وارتقا میں مدد کی اُن میں سید علی گیلانی صاحب اور پروفیسر رحمان راہی بھی شامل ہیں۔ وہ بڑے بذلہ سنج بھی تھے۔ جب کسی نے غصے میں اُن سے کہا کہ آپ کی ریش میں شیطان

چھپا ہوا ہے تو مسکرا کر جواب دینے لگے کہ ہاں ایک بال میں آپ کا چہرہ بھی نظر آرہا ہے۔ شیخ صاحب کی آپ بیتی ''آتشِ چنار'' میں اُن کو کافی کڑوی کڑوی سنائی گئی ہے۔ جب کسی نے اُن سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ شیخ صاحب کی خود نوشت ہے تو مولانا نے مسکرا کر جواب دیا خود نوشت ہو نہ ہو مگر خوب نوشت ضرور ہے۔ اُنہوں نے کشمیر کی معرکتہ الآراء موئے مبارک کی تحریک ۶۴۔۱۹۶۳ء کی رہنمائی کی اور اپنے زورِ کلام سے اُسے پُر امن بنائے رکھا۔ وہ ایک سیاسی یتیم کی طرح شہید ہوئے کہ جس ملک کی طرفداری کرنے کے لئے اُن کا خون بہایا گیا' وہاں اُن کو کوئی یاد نہیں کرتا بلکہ اُنہیں پدم شری جیسے چھوٹے موٹے خطاب سے بھی نہ نوازا گیا۔ لیکن وہ ان چیزوں سے سچ مچ ہی بے نیاز تھے۔ لیکن ایک مفکر' مدبر' مقرر اور صاحب طبل و علم کی حیثیت سے وہ ہماری تاریخ میں ایک خاص مقام کے مالک رہیں گے۔ وہ ایک فقیر کی طرح جیئے اور ایک شہید کی طرح مرے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

☆☆☆

☆......بلراج پوری

مولانا مسعودی......ایک فقید المثال انسان

مولانا محمد سعید مسعودی ریاست جموں و کشمیر کے ایک اعلیٰ پایہ مفکر، مدبر، سیاستدان اور مردِ قلندر گزرے ہیں۔ آپ کی شخصیت متنوع خصوصیات و امتیازات سے مزین ہونے کی بنیاد پر اپنے زمانے میں اپنی مثال آپ تھی۔ مرقع و متنوع شخصیت کے حامل ہونے کی بنیاد پر آپ وادیٔ کشمیر کے ایسے واحد رہنما گزرے ہیں جنہیں بلا لحاظ علاقہ و طبقہ قدر و منزلت اور تعظیم و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُنہیں شہرت نہ صرف ریاست بلکہ ریاست سے باہر بھی حاصل تھی۔ لیکن تمام امتیازات حاصل ہونے کے باوجود آپ بڑے سلیم الطبع اور کریم الاخلاق شخصیت کے مالک تھے۔ شریف النفسی اور منکسر المزاجی گویا آپ کی پہچان تھی۔

منفرد و ممتاز صلاحیتوں اور اعلیٰ پایہ کے منتظم ہونے کے باوصف مولانا نے کبھی کوئی سرکاری عہدہ و منصب قبول نہیں کیا اور نہ ہی آپ نے جموں و کشمیر کی سیاست میں ہراول رہنما کے طور پر اپنا رول ادا کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ کی ذات تصنع اور ریاکاری سے مبرا تھی۔ میرے ساتھ دوردرشن کے لئے آخری انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے مجھ سے تاکید کی کہ میں یہ انٹرویو صرف اپنے لئے محدود رکھوں اور کسی دوسرے شخص یا ادارے کو اس انٹرویو کی تفصیلات اور مندرجات سے ہرگز آگاہ نہ کروں۔ مذکورہ انٹرویو کے دوران آپ نے اس بات کا انکشاف کیا کہ ''اگر میں غیر کشمیری نہ ہوتا (مرحوم پہاڑی طبقے سے تعلق رکھتے تھے) تو ریاست کا تاریخی منظر نامہ کچھ اور ہوتا''۔ کشمیری

زبان نہ بولنے اور غیر کشمیری ہونے کے باوجود کشمیر کاز کی جتنی بے لوث خدمت مولانا نے انجام دی ہے شاید ہی کسی کشمیری لیڈر نے انجام دی ہوگی۔ تاہم اپنی کمزوری سے خوب باخبر ہونے کے سبب اُنہیں اپنے خیالات اور نظریہ کو ایک کشمیری لیڈر کی وساطت سے عوام الناس کے سامنے پیش کرنے پڑے۔ بلاشبہ شیخ محمد عبداللہ ایک موثر ترین اور بلند قامت سیاسی رہنما تھے جن کی وساطت سے مولانا نے اپنے خیالات واحساسات کو اُجاگر کیا۔ ۱۹۶۴ء میں شیخ محمد عبداللہ کی غیر موجودگی میں تحریک موئے مقدس کے دوران آپ نے میر واعظ مولوی محمد فاروق کے رول کی خوب سراہنا کی۔ اگرچہ وہ خود موئے مقدس کی شناخت اور اس کی بازیابی کی تحریک کے روحِ رواں رہے۔ مرحوم کے بقول:

"ماسوائے شیخ محمد عبداللہ اُس زمانے میں شاید ہی کوئی سیاسی رہنما تھا جس کے ساتھ میری فکری اور نظریاتی ہم آہنگی تھی اور جس کے ساتھ اختلاف کرنے کی بہت کم گنجائش تھی۔ اگرچہ شیخ محمد عبداللہ کے پہلے دورِ حکومت کے کئی فیصلوں اور طرز حکومت کی ہم نے ڈٹ کر کھلے عام تنقید کی اور اپنے تحفظات کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی ۱۹۵۳ء میں ہم نے شیخ محمد عبداللہ کی حکومت کو غیر جمہوری اور غیر قانونی طریقے سے ہٹانے اور اس کے بعد تا دیر پابند سلاسل رکھنے کی زور دار مخالفت اور مذمت بھی کی"۔

جب کبھی بھی میرا دہلی جانا ہوتا تو میں مولانا کی دہلی کی رہائش گاہ، جو اُسے بحیثیت ممبر پارلیمنٹ ملی تھی، بلا جھجک چلا جاتا تھا اور مولانا وہاں میرا پُر تپاک استقبال کرتے تھے۔ ہم دونوں مل بیٹھ کر آپس میں ریاست کے سیاسی منظر نامے پر سیر حاصل بحث وتمحیص اور غور وخوض کرتے تھے اور شیخ محمد عبداللہ کی جیل سے رہائی کے بارے میں طریقہ کار وضع کرتے اور پروگرام تشکیل دیتے تھے۔

مولانا اُن معزز ترین پارلیمنٹ ممبروں میں سے ایک تھے جنہیں راجیہ اور

لوک سبھا کے تمام اراکین قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔لوک سبھا میں ''دہلی معاہدہ' (Delhi Agreement) پر بحث کے جواب میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں مولانا مسعودی کی تقریر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مسعودی کشمیر کی موثر ترین آواز ہے۔اگرچہ مولانا نے بحث کے دوران اپنی تقریر میں حزب اختلاف کے لیڈر ڈاکٹر شیاما پرساد مکھر جی کی ''دہلی معاہدہ'' کے حوالے سے پیش کردہ تقریر کو ہدفِ تنقید بنالیا تھا اور اُن کو آڑے ہاتھوں لیا تھا جس پر ڈاکٹر مکھر جی اپنی نشست سے اُٹھ کر سیدھے مولانا کے پاس چلے گئے۔انہیں گلے لگایا اور بے باک اظہارِ خیال پر مولانا کو مبارکباد پیش کی۔ایک دفعہ کی بات ہے کہ مولانا مسعودی کو بخشی سرکار کے دوران قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔قتل کا یہ واقعہ بخشی اور شیخ عبداللہ کے حامیوں کے مابین ایک جھگڑے میں پیش آیا تھا تو میں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے سوال کیا کہ کیا آپ اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ مولانا قاتل ہو سکتے ہیں؟ میری یہ بات سُن کر وہ بہت افسردہ ہو گئے اور فوراً بخشی صاحب کے نام پیغام ارسال کیا کہ مولانا کے خلاف کیس واپس لیا جائے اور اُنہیں رہا کیا جائے۔

شیخ عبداللہ نے ہمیشہ مولانا کے سیاسی تدبر اور تنظیم سازی کی اہلیت پر انحصار کیا اور مولانا کی اہلیت و استعداد سے خوب استفادہ کیا ہے۔اپنی اسیری کے دوران اُنہیں مولانا کے تعاون کی زبردست ضرورت آن پڑی۔چونکہ مولانا کے اپنے معتبر اور مستند روابط پورے ہندوستان میں موجود تھے اور مولانا ہی اس قابل تھے کہ وہ یہاں وادئ کشمیر میں شیخ صاحب کے حامیوں کو منظم کر سکتے تھے۔اُس زمانے میں مولانا نے اپنے ناراض ساتھی جی۔ایم۔قرہ کے ساتھ بھی تعلقات استوار کیے تا کہ شیخ عبداللہ کی رہائی کے حق میں ایک زوردار اور موثر آواز اُٹھائی جائے اور بہتر اور منظم طریقے سے کارکنوں کی رہنمائی کی جائے۔

جب ۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ اور اندرا گاندھی کے مابین کشمیر پر معاہدہ طے ہو گیا اور شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار حاصل ہو گیا تو شیخ عبداللہ نے مجھ پر میر واعظ مولوی فاروق اور مولانا مسعودی کی تائید وحمایت کو یقینی بنانے کی ذمہ داری عائد کی تا کہ طے شدہ معاہدہ کا باضابطہ طور رسمی اعلان کیا جائے۔ میں نے شیخ عبداللہ کی اس تشویش سے اتفاق کیا کہ عین ممکن ہے کہ مولوی فاروق اس معاہدے کی مخالفت کریں کیونکہ شیخ اور میر واعظ کے مابین کی رسہ کشی پچھلے کچھ عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ مگر وہ مولانا مسعودی کے حوالے سے کیوں اس قدر متفکر تھے، میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس ضمن میں جب میں نے شیخ عبداللہ سے پوچھا کیا مولانا پاکستان نواز ہیں یا کیا مولانا آپ کے مدمقابل کھڑا ہونا چاہتے ہیں؟ تو شیخ عبداللہ نے جواب میں کہا، نہیں ایسی ہرگز کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں۔ میں اس بات پر فکر مند ہوں کہ اگر مولانا نے معاہدہ میں درج کسی بھی ایک لفظ یا اصطلاح کی تعبیر وتشریح کسی دوسرے انداز سے عوام الناس کے سامنے پیش کی جس کی وہ خوب اہلیت وصلاحیت رکھتے ہیں تو پورا معاہدہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا اور پوری وادی میں افراتفری اور بے یقینی کی صورتحال پیدا ہو سکتی ہے۔ بالالفاظ دیگر شیخ عبداللہ مولانا مسعودی کی دانشورانہ استعداد سے بخوبی واقف تھے اور اسے اس بات کا اندیشہ بھی لاحق تھا کہ مولانا کی ہلکی سی لفظی ہیر پھیر سے پورے معاہدہ کی ہوا نکل سکتی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کی خواہش کے مطابق میں گاندربل مولانا مسعودی کے گھر اُن سے ملنے چلا گیا تا کہ موصوف کو شیخ عبداللہ کی تشویش سے آگاہ کروں۔ میں اپنے مشن میں کامیاب ہو کر واپس لوٹا اور شیخ عبداللہ کے لئے یہ مژدۂ راحت اپنے ساتھ لایا کہ مولانا نے معاہدہ کے حق میں مکمل تائید وحمایت کا وعدہ کیا۔ اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد شیخ عبداللہ اور مولانا مسعودی کے مابین تعلقات میں بدمزگی اور تعطل پیدا ہو گیا۔ کچھ مفادِ خصوصی رکھنے والے عناصر نے دونوں کے مابین دوریاں اور تلخیاں پیدا کیں۔

۱۹۷۷ء میں مولانا مسعودی جنتا پارٹی کے جھنڈے تلے ریاست میں شیخ عبداللہ مخالف مختلف پارٹیوں اور تنظیموں کے رہنما کے طور پر اُبھرے۔ شیخ مخالف اُن طاقتوں اور پارٹیوں میں جی۔ ایم۔ قرہ، مولانا فاروق، جماعت اسلامی، سوشلسٹ اور جن سنگھ شامل تھے۔ مگر ۱۹۷۷ء کے اسمبلی انتخابات میں یہ اتحاد کئی وجوہات کی بناء پر شیخ عبداللہ کے سامنے ٹک نہیں پایا۔ اس اتحاد کی بنیادیں بہت ہی کمزور اور نحیف تھیں جس کے نتیجے میں یہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور مولانا نے اس کے ساتھ ہی گاندربل میں گوشہ نشینی اختیار کی۔

۱۹۸۴ء میں جب فاروق عبداللہ ریاست کے وزیر اعلیٰ تھے تو میں نے اُنہیں بُدھ سنگھ کی صد سالہ تقریب ولادت کی صدارت کے لئے مدعو کیا اور ان کے سامنے یہ تجویز بھی رکھ دی کہ مولانا مسعودی کو بحیثیت مہمانِ خصوصی بلایا جائے۔ فاروق عبداللہ نے مجھے جواب میں کہا کہ مولانا کا گاندربل سے جموں پہنچنا ناممکنات میں سے ہے۔ خیر میں نے سرینگر جانے کا پروگرام طے کیا تا کہ مولانا کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار بذاتِ خود کر سکوں۔ میں سرینگر ائیر پورٹ سے سیدھے اُن کے گھر واقع گاندربل گیا اور مولانا کے سامنے حاضری کی وجہ بیان کی۔ مولانا نے جواب میں کہا کہ ''میں تو نیم مردہ ہو چکا ہوں اور اس صورت میں نہیں ہوں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکوں''۔ مولانا کی نازک حالت دیکھ کر میں نے اپنی درخواست پر مزید تاکید کرنے سے گریز کیا اور بے نیل و مرام واپس لوٹ آیا۔

مذکورہ تقریب سے ایک رات پہلے کی بات ہے کہ مجھے مولانا مسعودی کے تا حیات سیکریٹری صوفی غلام محی الدین نے فون پر مطلع کیا کہ مولانا مسعودی جموں تشریف لا چکے ہیں اور ایک دوست کے ہاں بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ گاندربل سے جموں تک بذریعہ گاڑی کے پُر پیچ اور دُشوار سفر سے نڈھال ہو چکے

ہیں۔ دوسری صبح میں مولانا کو دیکھنے اُن کے پاس چلا گیا اور آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ مولانا آپ نے ایسی کمزور اور بیماری کی حالت میں سفر کرنے کی تکلیف کیوں اُٹھائی تو مولانا نے جواب دیا کہ آپ کے میرے ہاں سے چلے جانے کے بعد میں نے آپ کی درخواست پر خوب غور کیا اور مجھ پر یہ احساس غالب آگیا کہ میری زندگی پر صرف میرا ہی حق نہیں بنتا ہے۔ جب آپ جیسے دوست کو کسی تقریب میں میری شرکت کی ضرورت آن پڑے تو آپ کا بھی میری زندگی پر اتنا ہی حق بنتا ہے جتنا کہ مجھے اپنی زندگی پر۔

اُس پُر وقار تقریب میں مولانا کی شرکت سے اُس مقصد اور نصب العین کی پیروی ہوئی جس کے لئے ہم دونوں نے مل کر عمر بھر جدوجہد کی تھی۔ مولانا نے اپنی ضعیف العمری اور ناتوانی کی کوئی پرواہ کئے بغیر ہمارے مشترکہ نصب العین کی خدمت اور آبیاری کے لئے اذیت ناک تکلیف اُٹھانے کی زحمت بھی خوشی خوشی گوارا کی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے ذہن میں اس احساس نے تقویت حاصل کی کہ کہیں میں نے مولانا کو تقریب میں شرکت کی دعوت دے کر اُن کی زندگی سے کھلواڑ تو نہیں کیا۔

بالآخر وہ دن آہی گیا جب اُن کی زندگی کی شام واقع ہوگئی۔ بندوق برداروں کی گولیوں کا نشانہ بن کر وہ ابدی نیند سو گئے۔ جائے واردات پر موجود لوگوں کے مطابق آپ نے بندوق برداروں کو یہ کہہ کر خوش آمدید کیا کہ ''اگر آپ میری موت کے ذریعے اپنے مقصد اور مشن میں کامیاب ہوئے ہیں تو آپ شوق سے مجھے موت کے گھاٹ اُتار دیجئے۔

(انگریزی سے ترجمہ: ارشد حسین)

☆☆☆

(۱۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۴/۱۱ کو

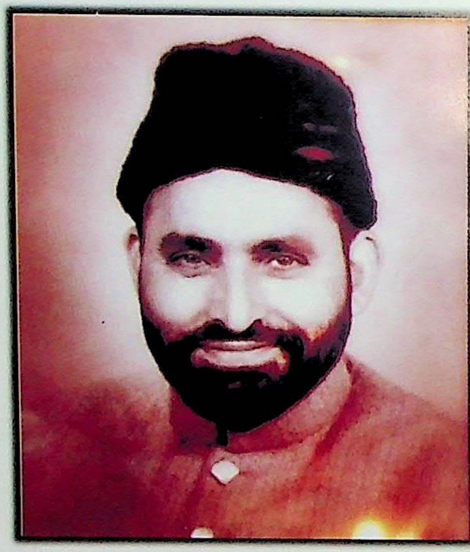
محترم خواجہ محمد یوسف صاحب ٹینگ کی عنایت سے آج ۱۴ نومبر کو
اکادمی کے دفتر میں حاضری کا موقعہ ملا، آپ نے شاندار اور
نایاب علمی اور مطبوعہ علمی جواہر کے گراں مایہ کا دیدار کرایا جس سے
قلب خزاں دیدہ غنچۂ نو بہار کی طرح شگفتہ ہو گیا۔
زمانہ کے انحطاط اور تنزل کے باوجود کچھ ہستیاں ابھی موجود ہیں
جن کے دم قدم سے علمی جواہرات کا قدر ہو سکتا ہے۔ محترم ٹینگ صاحب
بھی ایسی قافلۂ رفتہ کے پس ماندہ نگاروں سے ہیں۔ وہ اپنی
گراں گروں اوصاف و خصائص کی وجہ سے زندگی کے کسی میدان
میں بھی خاطر الصرام ہو سکتے ہیں مگر میری تمنا یہی ہے کہ ان کا مساعی
ہمیشہ کیلئے گم گشتہ علمی خزانے کی بازیابی کیلئے وقف رہیں۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی مساعی کامیابی کے ساتھ
ہمکنار ہوا کریں۔ فقط

محمد سعید مسعودی
14.11.82

عکسِ خط، مولانا محمد سعید مسعودی



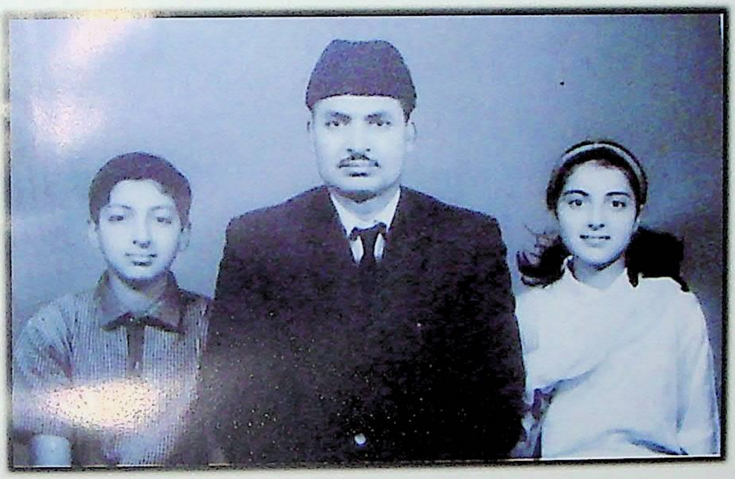
شیخ محمد عبداللہ، مولانا محمد سعید مسعودی اور دیگر عمائدین (بشکریہ شیرازہ پہاڑی)



مولانا محمد سعید مسعودی



مولانا محمد سعید مسعودی اپنے پوتے کے ہمراہ



مولانا محمد سعید مسعودی اپنے فرزند اور دختر کے ساتھ



مولانا محمد سعید مسعودی اپنی اہلیہ اور پوتے پوتیوں کے ساتھ

☆......غلام نبی خیال

مفکرِ کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی

مولانا محمد سعید مسعودی کے ساتھ میری خوش نصیبی کا ماحصل اُن کے تئیں میرے تعلقات کی خوبصورت تصویر اُس روز ایک سیاہ عکس میں تبدیل ہوگئی جب اس پیر بزرگ کو بے رحم ہاتھوں نے اُس وقت قتل کیا جب وہ بسترِ مرگ پر صاحبِ فراش تھے اور اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں یادِ خدا کرتے ہوئے گزار رہے تھے۔

۱۹۵۸ء میں مجھے ایک سیاسی مقدمے میں ملوث کر کے پسِ زنداں ڈال دیا گیا۔ سرینگر کے سنٹرل جیل میں مولانا کے ساتھ میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب اُنہیں بھی تقریباً ایک سو سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ نام نہاد حضرت بل قتل کیس میں ماخوذ کر کے گرفتار کیا گیا تھا۔ جیل کے روز و شب گزارنے کے عمل میں ہم قیدیوں کا یہ معمول بن گیا تھا کہ ہم روز صبح کو جیل خانے کے وسیع احاطے میں جمع ہو کر کشمیر کے سیاسی حالات اور دیگر اُمور پر تبادلۂ خیال کرتے تھے اور گفت وشنید کا یہ سلسلہ دوپہر تک جاری رہتا تھا۔ ان محفلوں میں جہاں مرزا غلام قادر بیگ اپنے پھیکے پھیکے لطیفوں سے دوسروں کے برعکس خود ہی محظوظ ہوتے تھے، وہاں مولانا انتہائی سنجیدگی کے عالم میں مختلف امور پر اپنی مفکرانہ رائے کا اظہار کرتے تھے اور اُن کے قولِ فیصل میں بحث و تکرار کی گنجائش بہت کم باقی رہتی تھی۔

مولانا کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں شعر و شاعری کے ساتھ شغف رکھتا ہوں تو اُنہوں نے میری حوصلہ افزائی اور رہبری کا بیڑا اُٹھایا۔ نظر بندی سے پہلے میں نے

ریڈیو کشمیر سرینگر کی لائبریری میں عمر خیام کا آغا شاعر قزلباش کا کِیا ہوا اردو ترجمہ پڑھا تھا۔ اگر چہ یہ ترجمہ فنی اور شعری اعتبار سے اتنا اثر انگیز اور دل نشین نہیں تھا لیکن خیام کے فلسفۂ حیات نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا اور اُسی وقت میرے دل میں یہ خواہش شدت سے جاگ اُٹھی تھی کہ عمر خیام کی رباعیات کا کشمیری میں ترجمہ کیا جانا چاہیئے۔

جب میں نے جیل میں مولانا کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو اُنہوں نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ کیا میں نے فارسی پڑھی ہے؟ جب میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ کہنے لگے "خیال صاحب! کسی بھی ادبی فن پارے کا ترجمہ کرنا مقصود ہو تو اصل سے کیا جانا چاہیئے ورنہ ترجمہ کے خدوخال پھیکے رہ جاتے ہیں"۔ ساتھ ہی یہ کہہ کر میرا دامن گویا خوشیوں کی سوغات سے بھر دیا کہ وہ خود مجھے فارسی پڑھائیں گے۔

اس طرح سے سنٹرل جیل میں مولانا صاحب کی وساطت سے فارسی کی مطبوعات گلستان بوستان، پیامِ مشرق اور دیوانِ حافظ آنے لگیں۔ یہ کتابیں دہلی سے مِس مردولا سارابائی بھیجا کرتی تھیں جنہیں اُس وقت کے علاحدگی پسند سیاست دان بہن جی کہہ کر پکارتے تھے اور جن کا گھر نئی دہلی کے راجدوت مارگ میں سیاست کاروں کے لئے قیام وطعام کا ایک مستقل مرکز بن چکا تھا۔

اسی دوران مجھے دیوانِ حافظ کے مطالعہ کا بھی موقعہ نصیب ہوا۔ یہ دیکھ کر میں بار بار ایک بات کو ذہن نشین کرنے کے لئے مُضطرب رہا کہ فارسی کے اس بُلبُلِ شیراز نے اپنے دیوان کا مطلعِ اول عربی زبان کے مصرعہ سے کیوں منتخب کرلیا تھا۔ دیوانِ حافظ کا اولین شعر یوں ہے:۔

اَلا یا ایہاالساقی ادرِ کاساً وناولہا
کہ عشق آسان بوداول ولے اُفتاد مشکلہا

میں نے اسی عالمِ تجسس میں ایک دن مولانا سے اس کے بارے میں سوال کیا

تو انہوں نے کہا ''آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ یہ مصرعۂ اوّل حافظ کا نہیں بلکہ یزید بن معاویہ کا ہے جو عربی زبان کا ایک پختہ مشق شاعر تھا۔ یزید کا اصلی شعر یوں ہے:

أنا المسموم ما عندی بتریاق ولا راقی
ادر کاساً وناولہا الا یا ایہا الساقی

اس کے معنے یوں ہیں کہ مجھے زہر دیا گیا ہے اور میرے پاس تریاق بھی نہیں ہے۔ اب یہی ایک راستہ بچا ہے میرے ساقی! کہ تُو جام بھر لے اور اُسے گردش میں لا''۔

مولانا نے اس بارے میں مزید فرمایا کہ جب حافظ کے نقادوں نے اس سے سوال کیا کہ آپ کو کیا ضرورت پڑی کہ آپ ایک شیعہ ہیں اور اس مسلک کے پیروکار ہو کر بھی قاتلِ اہلِ بیت یزید کے شعر کو اپنے دیوان کا سرنامہ بنائیں''۔ تو حافظ نے جواباً اُن سے کہا ''کیا آپ میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو ایک کتے کے گلے میں موتیوں کی مالا لٹکائے ہوئے دیکھے اور اُس سے یہ بیش بہا چیز چھیننے سے اجتناب کرے؟''

کسی اور بذلہ سنج شاعر نے بھی حافظ کی حمایت میں اس سوال کا جواب اس طرح دیا:

خواجہ حافظ را شبے دیدم بہ خواب
گفتمش اے عقل و دانش بے مثال
از چہ بر خود نسبتی شعرِ یزید؟
با وجودِ ایں ہمہ نقل و کمال
گفت واقف نیست در ایں مسئلہ
مالِ کافر ہست بر مومن حلال

یہاں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ حافظ شیعہ تھا یا سُنی۔ حافظ کا نام شمس الدین محمد تھا اور شبلی نعمانی نے اُن کے والد کا نام مولوی بہاؤ الدین بتایا ہے جو عام

طور پر سُنی مسلک کے لوگوں کا نام ہوتا ہے۔ شیعہ فرقہ کے پرستاروں کے اسماء کے ساتھ بالعموم جعفری، حیدری، کاظمی، حسینی، رضوی، فاطمی، انصاری، عابدی، جلالی، صفوی اور موسوی جیسے سرنامے جڑے ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال نے بھی غالباً حافظ کے اتباع میں یزید کے اس شعر کا یوں استفادہ کیا ہے:

دل گیتی اَنا المسموم اَنا المسموم فریادش
خرد نالاں کہ ما عندی بتریاقِ و لا راقی

دیوانِ حافظ کے اس دلچسپ آغاز سے کس طرح مولانا مسعودی کو کما حقہ آگاہی حاصل تھی۔ یہ اُنہی جیسے سخن فہم اصحابِ دانش وبینش کا خاصہ ہوسکتا ہے۔

ایک سال تک مولانا کی شاگردی میں مجھے فارسی کی ابجد سے واقفیت حاصل ہوئی اور اس تدریسی عمل کو مرحوم حسام الدین بانڈے نے مکمل کرلیا جو فارسی زبان و ادب پر خاصا عبور رکھتے تھے۔

اسی دوران جب میں نے مولانا صاحب کے سامنے خیام کی رباعیات کو کشمیری میں منتقل کرنے کی خواہش کا اعادہ کیا تو اُنہوں نے مس مررولا سارابائی کو خط لکھ کر سید سلیمان ندوی کی شہرہ آفاق تصنیف ''خیام'' دہلی سے منگوائی اور مجھے عنایت کر کے فرمایا ''لیجئے اب آپ کا مقصد پورا ہوا چاہتا ہے۔ اب آپ قلم اُٹھائے اور خیام کو خیال کا جامہ پہنائیے''۔

خیام کے ترجمہ کا یہ سلسلہ مسلسل اور غیر مسلسل طور پر جاری رہا اور مولانا بھی وقتاً فوقتاً اس بارے میں دریافت کرتے رہے۔ ایک بار انہوں نے خیام کی یہ رباعی پڑھ کر مجھ سے کہا کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں اس رباعی میں ''نرمک نرمک'' کا ترجمہ کس انداز میں کرتا ہوں۔ یہ رباعی یوں ہے:

وقتِ سحر است خیز اے مایۂ ناز
نرمک نرمک بادہ خور و چنگ نواز
کانہا کہ بجا یند نیابند دراز
والنہا کہ شدند کس نمی آید باز

اور جب مولانا نے اس رباعی کا میرا کیا ہوا یہ ترجمہ سُنا:

وِزِ چھ صُبح یارہ گوٚھ بیدار زُلفن مار گرٲے
اَستہ اَستے لولہ مسہ کی پیالہ برتے چنگ واے
یس یہ تمناہ اوس تس لاریو وتمہِ کے حسرتھاہ
قبرہِ یم نبنگاٲوی تِم نو آے واپس ہاے ہاے!

تو وہ بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ ''نرمک نرمک'' کا جو ترجمہ ''استہ اَستے'' کی شکل میں کیا گیا ہے وہ نہایت موزون اور برمحل ہے۔

اپنی قید و بند کے دوران میں نے ''رباعیات عمر خیام'' کا منظوم ترجمہ بھی مکمل کرلیا اور ایک زنداں نامہ ''زنجورہ ہُند ساز'' (سازِ زنجیر) کے نام سے ایک شعری مجموعہ کی شکل میں تخلیق کیا جو بعد میں ۱۹۶۳ء میں اشاعت پذیر ہوا اور جسے میں نے ''خلوص اور احترام کے ساتھ'' مولانا صاحب کی نذر کیا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ جیل میں ہمارے روزمرہ میں یہ مسلسل عمل شامل تھا کہ ہم قیدی ہر روز ناشتے کے بعد جیل کے صحن میں ایک مخصوص جگہ پر جمع ہوکر تبادلۂ خیال کرتے اور سرینگر ریڈیو کی خبروں کو ''جھوٹ کا پلندہ'' قرار دے کر ایک ذہنی آسودگی حاصل کرتے۔ ان غیر رسمی محفلوں میں محاذ رائے شماری کے جانے پہچانے اراکین صوفی محمد اکبر، مرزا غلام قادر بیگ ذیلدار، غلام محی الدین شاہ، حسام الدین بانڈے، علی محمد نایک، مرزا غلام قادر بیگ، مرزا محمد یعقوب، محمد خلیل جوہر، پیر مقبول ویلہ گامی، پیر یوسف شاہ مانکی

شریف، غلام قادر شیر گاندربلی اور کشمیر پولیٹیکل کانفرنس کے غلام رسول قرہ، عبدالحمید قرہ، محمد امین نحوی، شیخ غلام محمد اور مولوی عبدالحمید وکیل شوپیانی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

مولانا صاحب کے علمی تبحر کا یہ عالم تھا کہ وہ کشمیری، اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ پشتو زبان سے بھی پوری طرح واقف تھے لیکن بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ وہ انگریزی زبان پر بھی ناقابلِ یقین اور حیران کُن عبور رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بار بار یاد آجاتا ہے کہ ہمارے مقدمے کی شنوائی میں جو جیل ہی کے احاطے میں کیے جانے کا اعلان ہو چکا تھا، سرکار کی طرف سے غیر معمولی تاخیر کا مظاہرہ کیا جارہا تھا اور نظر بند قیدی اس دانستہ تغافُل سے تنگ آچکے تھے تو ہمارے زندانی احباب میں چند ماہرینِ قانون نے ایک طویل عرضی سرکار کے نام اس غرض سے تحریر کی کہ مقدمہ کی کاروائی میں مزید تاخیر نہ کی جائے۔ اس عرضی کا مسودہ اُس وقت کے ماہر وکلاء علی محمد نایک، مولوی عبدالحمید وکیل شوپیانی، غلام محی الدین شاہ، عبدالحمید قرہ، محمد امین نحوی اور مرزا یعقوب بیگ نے محنتِ شاقہ سے تیار کیا اور بعد میں یہ طے پایا کہ اس کا مسودہ مولانا کو بھی دکھایا جائے۔ شاید وہ کوئی مفید مشورہ دے سکیں۔ مولانا اس وقت جولاہی خانہ نام کی ایک عقب والی بارک میں پنڈت کشیپ بندھو کے ساتھ نظر بند تھے۔ عرضی میں ایک جگہ یہ لکھا گیا تھا کہ Speedy Trial شروع کی جائے۔ مولانا نے اس اپیل کو بغور پڑھنے کے بعد فرمایا ''میرے دوستو! Speed کا تعلق رفتار سے ہے یعنی اگر کوئی عمل شروع کیا جائے تو وہ رفتار بھی پکڑ سکتا ہے لیکن ہمارا مقدمہ تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہے لہٰذا میری ناچیز رائے میں یہاں پر Speed کی بجائے Immediate لکھا جائے یعنی مقدمہ کی کاروائی فوری طور پر شروع کی جائے''۔ نصف درجن تجربہ کار وکیلوں کی تحریر کردہ اس درخواست کا مفہوم کس طرح مولانا کے تجویز کردہ صرف ایک لفظ نے بدل ڈالا اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اسی طرح دہلی سے مس سارا بائی نے مولانا کے مطالعہ کی خاطر دنیا کے ممتاز فلسفی لارڈ برٹرینڈ رسل کی مشہور تصنیف The History of Western Philosophy بھیج دی تو ہمارے انگریز دان احباب نے مولانا سے درخواست کی کہ پہلے انہی کو یہ کتاب پڑھنے کا موقعہ دیا جائے۔ مولانا صاحب حسبِ دستور راضی ہوئے اور ایک صاحب کے ہاتھ یہ تصنیف دے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ ہی پہلے پڑھ کر اسے ذہن نشین کریں۔ میں انتظار کروں گا''۔

کوئی دو ہفتے بعد مولانا پھر ہمارے پاس تشریف لائے اور کتاب کا مطالعہ کے شوقین حضرات سے اس کا لب لباب بیان کرنے کو کہا لیکن حیرت ہے کہ وہ اس تاریخ ساز کتاب کے موضوع پر دو لفظ بھی بولنے سے قاصر رہے۔ اس کے بعد مولانا نے تقریباً نصف گھنٹے تک رسل کے فلسفہ کا تجزیہ کر کے اُس پر سیر حاصل روشنی ڈالی جس سے سبھی حیرت میں پڑ گئے۔ کیونکہ مولانا نے انگریزی میں کوئی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ یہ تھے مولانا مسعودی، عالمِ بے بدل اور فاضلِ بے مثال۔

مولانا کی گفتگو سے عام طور پر یہ واضح ہو جاتا تھا کہ وہ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں سے متاثر تھے البتہ ایک بار انہوں نے واضح طور پر انکشاف کیا کہ مولانا مودودی نے انہیں متاثر نہیں کیا ہے۔ فضلائے ہند میں مولانا کی نظروں میں اعلیٰ ترین مرتبہ مولانا آزاد ہی کو حاصل تھا اور انہوں نے بالخصوص جیل میں تحریر کردہ مولانا آزاد کی ''غبارِ خاطر'' کو بار بار پڑھ کے اسے کم وبیش از بر یاد کر لیا تھا۔ کئی مواقع پر انہوں نے مولانا آزاد کی بے مثال یادداشت کا تذکرہ کرتے ہوئے امام الہند کو ہندوستان کی شان اور روحِ ہند کا ایمان قرار دیا۔

جیل سے رہائی کے بعد مولانا ہی کی سفارش پر مجھے محاذ رائے شماری کے ترجمان ہفت روزہ ''محاذ'' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اس اخبار کی مجلسِ مشاورت میں مولانا

کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ اور غلام رسول کو چک شامل تھے۔ مولانا نے س بات کے پیشِ نظر اس مجلس کی کسی بھی نشست میں کبھی شمولیت نہیں کی کہ وہ مرزا نفضل بیگ کے ساتھ فکری اور سیاسی اختلافات رکھتے تھے۔ مولانا نے اس اخبار کے لئے کوئی مضمون بھی نہیں لکھا جبکہ شیخ محمد عبداللہ، بیگ صاحب، کو چک صاحب اور صدر الدین مجاہد وغیرہ اس کے صفحات پر اپنے بیانات، انٹرویو اور تصاویر کو چھپنے کے لئے مرحمت کرتے رہتے تھے۔

جب میں نے ایک بار مولانا سے یہ درخواست کی کہ میں ''محاذ'' کے لئے اُن کا ایک خصوصی انٹرویو لینا چاہتا ہوں تو انہوں نے یہ کہہ کر معذرت ظاہر کی کہ ''انٹرویو تو بڑے لوگوں کا لیا جاتا ہے۔ ستُو کھانے والے ایک گوجر کا انٹرویو بھلا کیا معنی رکھتا ہے؟''
مولانا محمد سعید مسعودی سرینگر سے چالیس کلومیٹر شمال میں گاندربل کے قصبے میں رہائش پذیر تھے اور میں وقتاً فوقتاً اُن کے پاس جایا کرتا تھا اور اُن کی علمی صلاحیتوں سے خوشہ چینی کرنے کو اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔ دورانِ گفتگو مولانا گھوم پھر کر ادب، ثقافت اور تاریخ کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر لیتے اور اُن کی نرم گفتاری میں مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد، مولوی عبدالحق، علامہ اقبال کے سوا حافظ، سعدی، رومی اور اردو فارسی اور عربی کی برگزیدہ شخصیات کا ذکر بار بار ہوتا اور یہ صحبت کبھی صبح سے لے کر شام تک جاری رہتی۔

اس دوران ''محاذ'' بھی اپنی اشاعت کے صرف ایک سال کے اندر ہی سرکار کی طرف سے پابندی عائد کئے جانے کے بعد بند ہو چکا تھا اور میں پھر ایک بار ادبی اور صحافتی دنیا میں اپنی آوارہ گردی میں ہوا کے جھونکوں کی طرح ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر اُڑتا رہتا۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مولانا مسعودی کے

اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو رہی تھی اور اس دوری کو اور بھی کشادہ کرنے میں بعض اپنوں کا ہاتھ صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

اسی دوران ایک ایسا حیران کُن اور افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ شیخ محمد عبداللہ جیسے تجربہ کار سیاست دان نے ۱۹۷۷ء میں گاندربل میں ایک عوامی جلسے کا انعقاد کیا جس میں اُنہوں نے مولانا پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ جب اس جلسے میں موجود مولانا اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی خاطر سٹیج کی طرف بڑھنے لگے تو اُنہیں دھکے دے دے کر آگے جانے نہیں دیا گیا اور وہ مضروب بھی ہوئے۔ مولانا کی تذلیل اور انہیں جسمانی تکلیف پہنچانے کے اس کارِ ثواب میں مولانا کا ایک احسان مند پیش پیش تھا جس کے لئے مولانا نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود پارلیمانی انتخابات میں اُس کی کامیابی کے لئے رات دن ایک کر کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ مہم چلائی تھی اور یہ وہی مولانا تھے جنہوں نے ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کی آغوش سب سے پہلے اُس کے لئے وا کی اور اُسے اسمبلی کا انتخاب لڑنے کے لئے نامزد کیا۔

۱۹۷۷ء میں جب مرکز میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو مولانا نے شیخ محمد عبداللہ کے خلاف ایک ہاری جانے والی جنگ کا بگل بجا دیا اور انہوں نے کشمیر میں بھی جنتا پارٹی کی بنیاد ڈالی۔

مولانا نے پارٹی کی قیادت سنبھالتے ہی مجھے بلاوا بھیجا اور یہ اصرار کرنے لگے کہ میں بھی اس تنظیم میں شامل ہو کر انتخاب لڑوں اور سرگرم سیاست کے میدان میں اُتروں۔ چونکہ سیاست سے مجھے گھن سی آرہی تھی اور یہ سلسلہ مجھے ایک جوہڑ کی طرح نظر آرہا تھا۔ میں نے مولانا سے معذرت کرتے ہوئے کہا "قبلہ میں تو اب کسی سیاسی جماعت کا رکن بننا نہیں چاہتا ہوں البتہ اگر آپ کا حکم ہو تو میں پارٹی کے دفتر میں بالواسطہ آپ کے لئے کوئی قلمی کام کر سکتا ہوں اور ایسا کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہوگی"۔

''آپ سیاست میں کس نظریئے کے حامی یا مخالف ہیں'' انہوں نے پوچھا۔ میں نے جواباً عرض کیا ''میں غیر جانب دار ہی رہنا چاہتا ہوں''۔

یہ سُن کر مولانا کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے یہ لطیفہ سُنا کر میری خبر لی۔ کہنے لگے کہ ''ایک بار ایک افغان سیاست دان نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ تم کس طرح کی سیاست سے وابستہ ہو۔ اس دوست نے جواب دیا میں کسی بھی سیاسی تنظیم کے ساتھ وابستہ نہیں ہوں کیونکہ میں ہمیشہ غیر جانبدار ہی رہنا چاہتا ہوں''۔

''اچھا۔ غیر جانب دار؟'' افغانی نے کہا اور اس جملے کو یوں مکمل کر لیا ''غیر جانب دار را در زبانِ ما مخنث مے گویند''۔

یہ طنزیہ تیر مجھ پر چلانے کے باوجود مولانا مجھے جنتا پارٹی کی صفوں میں شامل ہونے پر آمادہ نہ کر سکے، البتہ انہوں نے مجھے جنتا پاٹی کے دفتر میں کام کرنے کی پیشکش کی جس میں جماعت کے پریس نوٹ وغیرہ تیار کرنا شامل تھا اور اس کام کے عوض انہوں نے میرے لئے پونے چار سو روپے کا مشاہرہ مقرر کر لیا۔

جنتا کی لہریں اپنے ہی پانیوں میں غرقاب ہونے کے بعد یہ کام بھی مجھ سے چھوٹ گیا اور بقول کسے جب جھیل خشک ہو جاتی ہے تو مچھلیاں کھانے والے پرندے بھی غائب ہو جاتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں جنتا پارٹی ریاست میں شکست سے دوچار ہوئی اور اس کے دو یا تین امیدوار ہی میدانِ کارزار سے کامران ہو کے لوٹے۔ طرہ یہ کہ انتخابی میدان میں بیساکھیوں کے سہارے کُود کر ان جنتائی جانبازوں نے نتائج کا انتظار کئے بغیر ریاست کا وزیر اعلیٰ بننے کا اپنا اپنا حق سرِ عام جتلانا شروع کیا تھا۔ مولانا نے کسی بھی طرح مسندِ اقتدار پر براجمان ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔

مولانا مسعودی کی کُل متاع ایک چادر اور تھوڑا سا بستر کا سامان تھا جسے اُن کے عمر بھر کے معتمد غلام محی الدین صوفی نے لپیٹ کر اور بس میں سوار ہو کر گاندربل میں مولانا کی رہائش گاہ تک پہنچایا۔

اُس کے بعد مولانا نے ایک مسلسل ذہنی عذاب اور جذباتی بے چینی کا جو مختصر سا عرصہ دیکھا وہ تاریخِ کشمیر کا ایک الم ناک باب بن چکا ہے۔

میری نظروں میں مولانا محمد سعید مسعودی ایک صاحبِ نظر، دور اندیش، اُستادِ سخن اور بحر العلوم تھے۔ اگر چہ اسے بدقسمتی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ انہوں نے اپنی سیاسی یا ثقافتی یادداشتوں کو قلم بند نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج ہمارے پاس ہم عصر تاریخِ کشمیر کے کئی ایسے گوشے منور ہوئے ہوتے جن پر برابر آج تک شک اور یقین کی گرد جمی ہوئی ہے۔ غالباً انہوں نے اپنے قلم کو اس بنا پر حق گوئی سے دور رکھا کہ اُن کے سیاسی حلیف یا حریف دونوں اُن کی حقیقت بیانی سے خفا ہو جاتے اور پھر مولانا یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

مولانا مسعودی کشمیر کے عظیم فرزند تھے جنہوں نے اپنی پچاسی سالہ زندگی میں ہر گام پر اپنے ضمیر کے تقاضوں کا ساتھ دیا اور آخر دم تک وہ برابر اپنے اُن عقائد اور محسوسات کا تحفظ کرتے رہے جن پر اُنہیں یقینِ محکم تھا۔

دراصل کشمیریوں نے مولانا کی قدر نہیں کی۔ کئی تنگ نظر اُنہیں ''سوت گجر'' یعنی ستو کھانے والا غیر کشمیری گوجر سمجھتے رہے حالانکہ وہ مسکرا کر خود ہی کشمیری میں کہتے تھے ''میرے مہربان جب مجھے سوت گجر کہتے ہیں تو مجھے اس لئے خوشی ہوتی ہے کہ وہ مجھے اپنے ہی قبیل کا ایک فرد تو سمجھ لیتے ہیں''۔

اس کے برعکس اہلیان جموں کی طرف سے مولانا کی بھرپور پذیرائی ہوئی۔

جب ۱۹۸۹ء میں لالہ ملک راج صراف ٹرسٹ کی طرف سے انہیں اعزاز سے نوازا گیا۔ مولانا کے نام توصیفی سند میں کہا گیا تھا کہ ''مولانا مسعودی ایک سرکردہ مجاہد آزادی ہیں جنہوں نے پارلیمانی رکن کی حیثیت میں بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ ایک ممتاز صحافی بھی ہیں جو کشمیر کی تحریک میں اس کے اوائل سے ہی اہلِ کشمیر کے شعور کی آبیاری کرتے رہے ہیں''۔ اُس سال یہ اعزاز پانے والی دیگر شخصیات میں مرزا عارف بیگ، محمد سعید ملک، او۔ این۔ کول، غلام نبی خیال اور معراج الدین فوٹو گرافر شامل تھے۔

بالآخر ایک سال بعد کشمیر کا یہ ممتاز دانشور، پختہ ذہن اور دور رس سیاست دان، تجربہ کار صحافی اور بے لاگ اور سیدھا سادھا فرزند کشمیر بندوق برداروں کی گولیوں کا شکار ہوا جب وہ بذاتِ خود قریب المرگ تھے۔ آج اُن کی خستہ حال قبر اس یکتائے زمانہ شخصیت کی کہانی بزبان حالِ کہہ رہی ہے:

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبُلے

☆☆☆

☆......غلام نبی گوہر

مولانا مسعودی......میرا مؤکل

۱۹۵۷ء میں راقم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر سرینگر بار ایسوسی ایشن میں اپنے لئے کسی سینئر وکیل کی رہبری حاصل کرنے میں سرگرداں رہا۔ ایک پُر خلوص پنڈت ایڈوکیٹ نے مشورہ دیا کہ چرار شریف کا باشندہ ہونے کے ناطے میں بھی موقع پا کر وہیں بخشی مرحوم سے ملازمت کا نذر و نیاز مانگوں مگر اُفتادِ طبع وکالت اور سیاست کی طرف ہی مائل تھا۔ اس طرح بیکاری کے دن چناروں کے سائے میں گزارتے گزارتے معزز سیاسی پناہ گزین وکیل مرحوم خواجہ محمد امین کے ساتھ ہم نشین ہوا اور رفتہ رفتہ قربت بڑھ گئی۔ اُن ایام میں لاتعداد سیاسی مقدمات تھے۔ ہر ایک محاذی' پولیٹکل کانفرنسی ورکر کیا بلکہ ہمدرد تک کسی نہ کسی فوجداری مقدمہ میں عدالتوں کی خاک چھان رہا تھا۔ ان مقدمات میں اہم ترین سرکار بنام عبدالعزیز شگو وغیرہ بجرم ۲/۳ ____ E.A.O (Enemy Agents Ordinance) سنٹرل جیل میں سیشن جج تریلو کی ناتھ مٹو کی زیرِ سماعت تھا۔ امین صاحب بھی اُس میں وکیل صفائی تھے تو اُن کے جونیئر کی حیثیت سے میں نے بھی جیل یاترا شروع کی۔ اُس مقدمہ کے ملزمان میں کئی احباب کے صبر و تحمل بُردباری اور صلاحیتوں نے مجھے متاثر کیا۔ خصوصاً اسلام آباد کے مرحوم ڈاکٹر شیخ عبدالمجید صاحب میرے چہیتے بن گئے۔ مرحوم عبدالحمید قرہ اور محمد امین نحوی ایڈوکیٹ صاحبان جو اس مقدمہ میں اہم ملزمان تھے میرے مداح بن گئے۔

اس دوران آبی گزر میں خواجہ امین صاحب کے مکان پر مولانا مسعودی

صاحب سے تعارف ہوا تو پھر اُن کے پاس کبھی کبھار اُن کے بھائی نذیر صاحب کے ہاں ملنے کو جاتا تھا۔ مولانا اُنہی ایام میں ہندوستانی پارلیمنٹ کی سیٹ سے محروم کئے گئے تھے۔ مراعات بھی بخشی صاحب نے اُن سے چھین لی تھیں۔ اُن کی حالت اُس وقت گومگو تھی۔ نئی برسر اقتدار جماعت اُنہیں دشمنِ اول مانتی تھی اور کاروان جس کی قیادت شیخ و بیگ کر رہے تھے اُنہیں ہندوستانی ایجنٹ مانتے تھے۔ اولاً میں اُسی تعصب کے ساتھ اُن سے ملا مگر رفتہ رفتہ جان لیا کہ نہ وہ ادھر تھے نہ اُدھر یہ ایک لاینحل معمہ رہا کہ حقیقت میں وہ کیا چاہتے تھے۔ البتہ وہ ہندوستانی سول سوسائٹی کے اُن جمہور نواز عناصر کے ساتھ سرگرمِ عمل تھے جو شیخ و برہمن (نہرو) کے مابین پڑی دراڑ کو پاٹنے کے عمل میں جُٹ گئے تھے۔ وہ بھی 'نہرو عبداللہ' مفاہمت کے قائل تھے۔ اس طور وہ بھی اس لابی کا سرگرم رکن تھے جو شیخ صاحب کی بلا جواز نظر بندی کے خلاف تھے۔

"۲۶/ ۲۷ فروری ۱۹۵۸ء رات گئے کو سپیشل سٹاف سرینگر کوٹھی باغ میں یعنی عبدالرشید جنرل سیکریٹری نیشنل کانفرنس گاندربل کے پاس مہمان تھا تو طے پایا کہ ۲۸ر فروری کو نسیم باغ میں ضلع کمیٹی کا جلسہ ہوگا۔ وہاں لاؤڈ سپیکر سے شیخ کے خلاف تقریریں کی جائیں گی۔ لوگ مشتعل ہو کر حملہ کریں گے اور اُس ہنگامے میں ضلع صدر سیف الدین مخدومی کے پیٹ میں کرایہ کا غنڈہ چھرا گھونپ دے گا۔ اب ۲۸ر فروری کو خیمہ نصب ہوا، لاؤڈ سپیکر سے اشتعال انگیزی ہوئی۔ مگر رضا کاروں نے مولانا کی ہدایات پر عوام کو مشتعل ہونے سے روکا۔ ناکامی کی خفت کو مٹانے کے لئے سول میں جلوس پیس برگیڈی کے لوگوں کو گاندربل کے راستہ سے ٹرکوں میں لایا گیا جنہوں نے خیمہ پر دھاوا بول دیا۔ مخدومی برادران نے سازش کو ناکام کرنے کے لئے کاروائی کی تھی۔ مہدہ بانڈے چھرا لے کر سیف الدین کو گھونپنے کے لئے تاک میں تھا کہ خیمہ گر گیا۔ بھاگم بھاگ میں وہ اپنی کھونٹی پر گر گیا اور اُس کی پسلی پر چوٹ آئی۔ خون بہنے لگا، ایمبولنس تیار

بہ تیار آئی اور اُس کو وہاں سے ہسپتال لیتے ہوئے خون روکنے کی کوشش نہ کی گئی بلکہ ایک روایت ہے کہ زخم کو اور گہرا کیا گیا کہ وہ جب ہسپتال پہنچا تو سارا خون بہنے سے دم توڑ چکا تھا۔ مجسٹریٹ درجہ اول کے روبرو بیان نزع قلمبند ہونا دکھایا گیا۔ کہتے ہیں کہ مجسٹریٹ نے مردہ مہدہ بانڈے کا عکس انگوٹھا ثبت کیا اور بیانِ نزع کی عبارت سپیشل سٹاف کوٹھی باغ میں لکھی گئی کہ ایک مشتعل جم غفیر نے مولوی محمد سعید مسعودی' خواجہ علی شاہ بٹھ معراج الدین شاہ بٹھ' مرزا غلام قادر بیگ وغیرہ کی رہبری میں نیشنل کانفرنس کے کیمپ پر دھاوا بول دیا۔ اشتعال' شیخ محمد عبداللہ نے عوام میں حکومت کو گرانے کے لئے اپنی لمبی تقریر میں دیا۔ ہجوم حملہ آور ہوا' مہدہ بانڈے کو پکڑا گیا گرفت میں لیا اور ان راہبروں نے مقبول قریشی عرف قبائلی کو اُکسایا اور اُس نے مہدہ بانڈے کی پسلی میں چھرا گھونپ دیا۔"

تفتیش اور گرفتاریاں مارچ ۱۹۵۸ء کی پہلی رات سے شروع ہوئیں۔ اسی طرح مولانا بحیثیت ملزم اول گرفتار ہوئے جبکہ الزام علیہ اشیخ محمد عبداللہ کو رپورٹ اور چالان میں بتایا گیا تھا مگر اُنہیں اُس مقدمہ میں بعد میں از زمرۂ ملزمان خارج کیا گیا۔ مولوی کے ساتھ ایک سو عمایدین جن میں ۹۹ افراد محاذ رائے شماری' پولیٹکل کانفرنس یا غیر جماعتی زعما تھے سب گرفتار ہوئے۔ صرف غلام نبی خیال غیر سیاسی تھا اور نتھی ہوا تھا۔ ریمانڈ تفتیش کے دوران ADM سرینگر ٹی این مٹو کے پاس ضمانت اور درخواست ماسوائے ملزمان پیش کیا جاتا تھا۔ حسب استدعا ریمانڈ ملتا گیا۔ اب اسی کے ساتھ شیخ صاحب نے غلام رسول کوچک' خواجہ مبارک شاہ وغیرہ کی سربراہ میں لیگل ڈیفینس کمیٹی قائم کی۔ امین صاحب اور راقم اُس کے ممبران نامزد ہوئے مگران سبھوں کو بھی ۲۸/۳۲ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کیا گیا اور اب میں سیکریٹری لیگل ڈیفینس مقرر ہوا۔ دفتر میرا کمرہ ۲۹ مجسٹک ہوٹل میں کرایہ پر لیا گیا اور کمرہ ۳۰ میں راقم رہائش پذیر

ہوا۔اس طرح اب امین صاحب اور میں کشمیر بھر کی عدالتوں میں ملوث قومی لیڈران کی وکالت میں مشغول ہوئے۔شوپیان میں میر منصور، پلوامہ میں ماسٹر ولی ملک، غلام قادر مورن، غلام قادر راشمندر، اسلام آباد میں غلام حسن انقلابی، غلام احمد ذیلدار، کلگام میں غلام رسول رینہ واری۔اسی طرح سوپور، بارہمولہ، اوڑی وغیرہ میں ہماری بھاگم بھاگ تھی۔مگر حضرت بل قتل کیس کے ملزمان کو ہر پندرہ روز بعد معیادِ ریمانڈ کی توسیع ہوتی تھی تو شیخ صاحب کو روزانہ رپورٹ دیتے ہوئے وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ ریمانڈ کی حد کیا ہے۔ راقم ضابطہ میں اتنا ابھی نابلد تھا کہ میں ڈانواڈول جواب دیتا رہا۔مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔تاریخ سازشہرِ سرینگر میں اُس وقت تین وکلا بچے تھے۔قانونی مشیر کی صورت میں یہ تنکا اور دیگر تین شیخ عبدالمجید، کیپٹن ڈار اور حکیم جواد باغوان پورہ، لطیف صاحب وکالت تک محدود تھے۔امین بھی صورہ جانے سے گریز کرتا رہا کیونکہ اس کی کسی وقت گرفتاری متوقع تھی ۔ بسترا باندھا ہوا تھا ۔ اتنے میں ٹی این مٹو صاحب جو ADM سرینگر ہونے کے علاوہ سپیشل جج کی حیثیت سے E.A.O.۲/۳ کے تحت مقدمہ سماعت کر رہے تھے، نے ملزمان حمید قرہ، محمد امین نحوی وغیرہ کو چودہ چودہ سال قید کی سزائیں سنائیں اور اس سے پہلے ہی مسٹر روگناتھ ویشنوی صدر لیگل ڈیفنس کمیٹی پھر گرفتار ہوئے تھے تو اُنہوں نے جیل سے اپیل کی کہ خاکہ میرے پاس بھیج دیا جائے جو لے کر امین صاحب سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کے لئے گئے کیونکہ ہائی کورٹ کو سماعت کا اختیار نہیں رکھا گیا تھا۔مگر جمہوری ہندوستان میں اپیل دائر کرنے کے لئے کوئی وکیل نہ ملا تو امین صاحب نے Sir Dingle Foot برطانوی قانون دان کی خدمات حاصل کیں جس نے صرف ویشنوی بریف قابل پذیرائی مان کر اُنہی وجوہات پر اپیل دائر کی اور سزا ملتوی رکھنے کا حکمِ التوا حاصل کیا۔وہ دلی میں تھے کہ شب قدر کو (اپریل ۵۸ء) شیخ صاحب پھر گرفتار ہوئے اور جس طرح آمد کے استقبال پر لوگ

جوق در جوق شامل ہوئے تھے اسی طرح اُن کی گرفتاری کے ردِعمل میں ہوا اور کچھ دن بعد کشمیر سازش کیس بخلاف مرزا محمد افضل بیگ وغیرہ دائر ہوا اور دونوں مقدمات حضرت بل اور سازش مقدمات نے پنڈت نیل کنٹ گنجو اور پنڈت نیل کنٹ ہاک سپیشل دفعہ ۱۴ کے تحت مقرر ہوئے۔ چالان قتل کیس کا سنٹرل جیل سرینگر میں گنجو صاحب کے پاس پیش ہوا اور استغاثہ سازش کیس DW. Mehra I.GPK جموں و کشمیر نے ہاک صاحب کے پاس پیش کیا اور عدالت کے لئے مقام کُد مقرر ہوا۔ اب بہت کوشش کے بعد محمد لطیف قریشی، خواجہ غلام محمد وانی اور راقم کے علاوہ ہم نے جزوی طور آر۔ وی۔ ایس مانی سپریم کورٹ ایڈوکیٹ اور امیر سنگھ امبالوی پنجاب ہائی کورٹ کی خدمات حاصل کیں۔ سازش کیس کے بارے میں یہاں بات نہیں کروں گا۔ کیونکہ مولانا اس میں ملزم نہ تھے۔ اب مولانا کے پاس مسئلہ تھا وہ کس وکیل کے وکالت نامہ پر دستخط کریں تو یہ امتیاز و شرف انہوں نے اس ناپختہ وکیل کو عطا کیا اور اس طرح میں اس مقدمہ میں آپ کا اور سازش مقدمہ میں شیخ صاحب کا وکیل بن گیا۔ مگر مولانا بذات خود اتنے بڑے وکیل تھے کہ اُن کی یہ جہت واضح کرنا مجھ پر تاریخی فرض عاید ہوتا ہے۔

قارئین راقم کے اس دعویٰ پر شاید قہقہہ ماریں گے مگر میں تائیداً عرض کرتا ہوں کہ موصوف نے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۶ء تک کے کرمنل لا جرنل کی جیل میں ایک قسم کی لائبریری یہ کہہ کر ہم سے بنوائی کہ اُن کے ہمراہ دیگر ملزمان میں پانچ چھ وکلا ہیں لہٰذا اُن کو ڈیفنس وکلا کی مدد کے لئے مامور کرے گا مگر جو وکیل تھے مثلاً خواجہ غلام محی الدین ہمدانی، غلام محی الدین شاہ، غلام محمد چکن، مولوی عبدالحمید وغیرہ اُن سب کے رویہ عام ملزمان سے پست تر تھا چہ جائیکہ وہ قانونی مدد کرتے وہ ایسے مطالبات کرتے تھے جو ناممکن تھے مثلاً ''ہم کیا چور ہیں، ڈاکو ہیں، قاتل ہیں۔ ہمیں فوراً ضمانت پر چھوڑا جائے۔'' مولانا نے اُنہیں پھر سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''ہم قاتل نہیں ہیں مگر قتل کے

الزام میں ملوث ہیں جو جرم نا قابلِ ضمانت ہے۔اس طرح سمجھانے کے باوصف ایک صاحب مُصر تھے کہ چونکہ وہ سابقہ منسٹر تھے اس لئے قاتل نہیں ہو سکتے ہیں''۔اس ماحول میں ایک مولوی یعنی مسعودی نے اپنے ساتھ ایک عدد ڈاکٹر مرحوم عبدالمجید شیخ' ایک دکاندار مرحوم غلام رسول قرہ اور ایک میٹریکیولیٹ سابقہ سول سرونٹ مرزا غلام قادر بیگ نے وکلا ٹیم کے لئے موزون حوالہ جات تیار رکھے تھے۔اُس راہبری کے لئے مدراسی وکیل آر۔وی۔ایس مالی مولانا کا مداح ہی نہیں بلکہ فین بن گئے۔

باور ہوا کہ دونوں سیاسی متضاد کیمپ بخشی منن لابی اور بیگ لابی مولانا سے خائف تھے۔مولانا کو اس بات کا پورا احساس اور شعور تھا کہ منن بلکہ بعد میں اندرا بھی اُس کے خلاف نہرو کے کان بھرتے تھے اور بیگ نے شیخ کو مطمئن کیا تھا کہ مولوی ایجنٹ ہے۔اُس اطمینان کو بہت حد تک مولوی اور شیخ کے مابین جنوری ۱۹۵۸ء سے لے کر ۲۸رفروری ۱۹۵۸ء تک کی قلیل صحبت نے گو کہ کم کیا تھا مگر تعصّبات میں نمایاں فرق نہیں آیا۔اس لئے مولوی بحیثیت ملزم حضرت بل قتل مقدمہ پر بات کرنے میں احتیاط برتتے تھے۔اُن کا ہر ردِ عمل محتاط تھا تا ایں کہ نہ نہرو کے گرد مضبوط لابی کو بلواسطہ یا بلاواسطہ مواد کان بھرنے کا ملے نہ بیگ صاحب کو اُن کے خلاف شیخ مسموم کرنے کا حیلہ وجحت بہم ہو پائے۔مولانا ایک منفرد سیاسی اکائی ہونے کے باوصف اُس وقت کسی حزب کے ساتھ عملاً وابستہ نہ تھے اور ایسی بالواسطہ مناسبت سے بھی کوسوں دور تھے۔اسی پسِ منظر میں گنجو صاحب کی عدالت میں استفسارات ملزمان قلمبند کرنے کا تحت دفعہ ۳۴۲ صرف مقام آیا۔اس بیان میں سوالنامہ بھی طے شدہ فارمیٹ ہی ہے اور جواب نامہ بھی رسمی ہے مگر مولانا کی حساس پوزیشن کی وجہ سے اُنہیں الفاظ کا احتیاط سے استعمال کرنا تھا۔سوال مشترکہ تھا کہ اگر آپ نے جرم نہیں کیا تھا تو شہادت کیوں خلاف آئی اور وجہ استغاثہ کیا ہے۔سب ملزمان نے یہی مشترکہ جواب دیا

کہ سیاسی عناد جھوٹے مقدمہ کی وجہ ہے۔مگر مولوی نے ایسا جواب دیا کہ اُن کے خلاف دونوں لابیاں دم بخود رہ گئیں۔آپ نے جواباً کہا:

نہ گُلم نہ برگ سبزم نہ درختِ سایہ دارم
در حیدتم کہ دہقان بہ چہ کار کشت مارا

ایک مرحلہ پر دو ملزمان غلام نبی خیال اور مرحوم محمد عبداللہ پال جو ضمانت پر رہا ہوئے تھے حاضریٔ عدالت سے دور رکھے گئے تا اینکہ اُن کی بذریعہ وارنٹ طلبی ہو کر مقدمہ بلا کاروائی کے ملتوی ہوتا رہے۔وہ دونوں بیماری کی وجہ سے ضمانت پر رہا ہوئے تھے گو کہ اُن کے بمقابلہ دیگر ملزمان زیادہ مہلک بیماریوں میں مبتلا تھے۔مولانا تپ دق کے مریض، غلام قادر بیگ معدہ کے السر کا مریض، خواجہ غلام محی الدین ہمدانی زہرہ کو اُنہی دنوں انتڑیوں کا آپریشن ہوا تھا۔خواجہ علی شاہ معمر ہونے کے علاوہ دائمۃ المریض تھا۔مگر اُن کی اور ہم چو قسم دیگر بیمار ملزمان کی درخواست ہائے ضمانت نامنظور ہوئیں۔دیگر ملزمان کا خدشہ تھا کہ اُن دو کو دانستہ طور مقدمہ کو طول دینے کے لئے رہا کیا گیا تھا۔شہادت قلمبند کرنے کا مرحلہ تھا کہ مستغیث سیف الدین مخدومی جس کو پہلے حاضر ہونا تھا۔اُس نے ایم ایل سی کا رتبہ چاہا تو وہ دیا گیا پھر بھی نہیں آیا تو وزیر مملکت بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔بخشی صاحب نیم خام ہاں کر چکے تھے مگر رشید صاحب سیخ پا ہوئے اور مقدمہ میں التوا پر التوا پڑتے گئے۔ناچار جج نے آخری مہلت دی، پھر شہادت ختم کرنے کا مشروط حکم دیا۔مگر نہ مخدومی کو منسٹر بنایا جا سکا نہ وہ حاضر ہوئے۔اُس تاریخ پر ضمانت پر رہا دونوں ملزمان غیر حاضر تھے۔وارنٹ اجرا ہوئی پولیس نے وارنٹ کی تعمیل کئی مہینے نہ کی تو آخر ہائی کورٹ کے حکم کے تحت وہ لائے گئے اور شہادت کے حکم کی تجدید ہوئی۔دوسری تاریخ پر اُنہیں پھر غیر حاضر کرنے کی سازش ہوئی مگر ہم نے اُن دونوں سے الگ الگ درخواستیں حاصل کیں کہ وہ بیمار ہیں۔اُن کی درخواست پر ہم نے

جج صاحب سے حکم لکھوایا کہ ملزمان متذکرہ دونوں کو تا حکم ثانی مستثنیٰ رکھا گیا۔ اب شہادت پیش کرنے کا کوئی حیلہ نہیں تھا۔ استغاثہ کے وکلا جن کا رول پیشہ ورانہ اخلاق سے بالاتر ہوکر انصاف کا اعتبار مجروح کرانے کا تھا عبدالرشید بخشی کی خوش نودی کے لئے پیشی سے قبل چیمبر میں جج سے ملے اور اُنہیں تنبیہ کی گئی کہ اُس نے وہ حکم کیوں دیا تھا کیونکہ گواہان حاضر نہیں تھے۔ شہادت ختم کرنے کا حکم ناگزیر بن چکا تھا تو جج نے غلام قادروانی ریڈر کو بلایا۔ مثل منگوائی گئی پیشی کے دوران مثل لائی گئی تو ہماری استدعا تھی کہ شہادت ختم کرنے کا سابقہ مشروط حکم اُس وقت سے نافذ العمل تھا اور شہادت استغاثہ ختم ہوگئی۔ رادھا کرشن کاندرو وکیل استغاثہ نے ملزمان پالؔ اور خیالؔ کی غیر حاضری کا حیلہ بنایا۔ ہم نے درخواست کے بارے میں جواب دیا جج نے مثل کی ورق گردانی کر کے درخواست گم پا کر کلرک کو بلایا اور اُس نے منہ پر جج سے کہا کہ "وہ درخواست آپ نے مثل سے چُرائی" اس پر ہنگامہ بپا ہوا۔ ملزمان اناپ شناپ بولتے رہے۔ جج نظم قائم نہ کر پایا تو مولانا صاحب نے نظم و نسق قائم کر کے بہت حلیمی کے ساتھ جج کی طرف مخاطب ہوکر عرض کیا "جناب والا! مرحوم مولانا آزاد کی صحبت کے اثر سے حلف لیا تھا کہ چونکہ انگریزی خواندہ نہیں ہوں اس لئے کبھی کوئی انگریزی لفظ استعمال نہیں کروں گا۔ مگر جناب کے شایانِ شان مناسب لقب کا لفظ اردو اور فارسی فرہنگوں میں ڈھونڈا نہ ملا اس لئے مجبوراً یہ انگریزی لفظ استعمال کرنے کی غلطی کر رہا ہوں۔ آپ نے شب خون نہیں بلکہ دن دھاڑے "ڈکیتی" کی اور اس طرح تجربہ کار ڈکیوئٹ آپ ہیں۔ مولانا کا یہ کہنا کہ استغاثہ وکلا ہم سب کے سب دم بخود ہوئے جج منہ کھولے دیکھ رہا ہے اور سردار امر سنگھ انبالوی وکیل صفائی کھڑا ہوا" ۔ جناب عالی میرے موکل نے توہین عدالت کی ہے۔ بحیثیت آفیسر آف دی کورٹ استدعا کرتا ہوں کہ اس کے خلاف توہینِ عدالت کی کارروائی شروع کی جائے"۔

''وکیل صاحب' مولانا ہمارے قائد ہیں انہیں کچھ بھی کہنے کا اختیار ہے اور کچھری کے ڈرامہ کا ڈراپ سین ہوا۔

اسی طرح راقم مولانا صاحب کے ساتھ ذاتی مراسم میں منسلک رہا حتیٰ کہ جب ۱۹۶۰ء کے آخر پر محاذی لیڈران کے اقرباوکلا کے طور پر ڈیفنس کے ساتھ وابستہ ہوئے اور جب رہاشدہ محاذی لیڈران نے اس لیگل کمیٹی پر دھونس مارنا شروع کیا تو مجھ پر بھی ایک قسم سے بلواسطہ دباؤ پڑ گیا کہ محاذ کے ساتھ اعلاناً وابستہ ہوجاؤں اور پولیٹکل کانفرنس کے ملزمان کی پیروی سے دور رہوں۔اس امر پر مرحوم غلام احمد شاہ کے ساتھ خواجہ مرحوم مبارک شاہ بھی اختلاف کرتے رہے اور مرحوم لطیف صاحب بھی مگر شاہ صاحب نہ جنبد گل محمد کے مترادف اٹل رہے اور مولانا سے مشورہ حاصل کر کے میں نے لیگل ڈیفنس کمیٹی سے علاحدگی اختیار کی اور بڈگام منصفی میں وکالت کرنے کے لئے وہیں مقیم ہوا۔وہیں سے ۱۹۶۱ء میں نے کے۔اے۔ایس جوڈیشل کے مقابلہ امتحان میں شرکت کی مگر نتیجہ معرض التوا میں رہا۔۱۹۶۲ء کی آمد پر مولانا جیل سے رہا ہوئے اور مجھے اُس سال کے انتخاب میں کودنے کی ہمت افزائی کرتے رہے بلکہ ترغیب اُنہوں نے ہی دی اور خیال بھی اُن کا ہی تھا تو میں نے فروری ۱۹۶۲ء میں چرارشریف اور بڈگام حلقہ جات سے نامزدگی فارم داخل کئے۔ چرارشریف حلقہ سے فارم نامنظور ہوا اور بخشی عبدالرشید وہاں سے بلا مقابلہ کامیاب قرار دیئے گئے۔بڈگام سے میں پورے عزم کے ساتھ ڈی این سی اور پرجا سوشلسٹ پارٹی کے اشتراک سے لڑتا رہا۔اس حزبِ متحدہ کو بالواسطہ مولانا کی حمایت مشترکہ طور حاصل تھی۔جبہ کدل حلقہ سے ڈی پی دھر کے خلاف ڈی این سی کے اُمیدوار ملک غلام محمد ایڈوکیٹ تھے۔دھر صاحب کو یقین ہوا تھا کہ اُس کا وہی حشر ہوگا جو ۱۹۵۷ء میں رینزو کا بخشی اور عبداللہ نے کروایا تھا تو اُس نے ڈی این ایس کی ایک لابی سرگرم کی اور جب جموں کے انتخابات میں ڈی این سی

نمائندہ گان سیٹھی اور صراف کے علی الخصوص ووٹوں کا سرمایہ ہی نذرِ آتش کیا تو اس کشمیری ڈی این سی لابی نے ووٹنگ سے بائیکاٹ کی تحریک چلائی۔ ہمارے ساتھی اس لابی کے اثر میں آئے۔ جموں لیڈر شپ کے انکار کے باوصف پولنگ سے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ میں نے اس بیان پر دستخط کیے تو مولانا ناراض ہوئے۔ مجھے بلاوا بھیجا۔ جب میں نے عذر پیش کیا کہ ۴۴ میں سے ۳۰ پولنگ ایجنٹ ڈی این سی کے ورکران تھے تو وہ میرے فیصلہ پر مطمئن ہوئے مگر تب کفِ افسوس ملتے رہے کہ پولنگ میں عدم شرکت کے باوجود ۱۰۱۷ ووٹوں سے برسر اقتدار پارٹی کے نمائندہ کے آگے تھے اور ریٹرننگ آفیسر مرحوم محمد صادق بٹ منصف بڈگام نے ہارے ہوئے نمائندہ کو کامیاب قرار دینے سے انکار کیا تھا تو مولانا نے افسوس کیا بلکہ مجھے کوسا کہ میں نے ووٹ شماری کے آخری مرحلہ پر شرکت کرنے سے بھی کیوں انکار کیا تھا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اُس مرحلہ پر مرحوم عبدالرحمٰن راحت اور غلام حسن ڈار او مپورہ نیشنل لیڈران میرے دفتر پر ذاتی طور مجھے شرکت کرنے کے لئے بلاوا لے کر آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انتخابات میں دھاندلیوں پر کسی حد تک پردہ ڈالنے کے لئے بخشی صاحب بھی یہ سیٹ چھوڑنے پر مصر تھے۔ حق تو یہ ہے کہ انتخاب لڑنا اُس وقت قومی فیصلہ کے خلاف واضح بغاوت تھی اور اس بے ضمیری پر میرا بعد میں ضمیر شناسی اور اصول پرستی کا لیبل لگانا محض تضادِ فکر کا غماز تھا۔ اس طرح میں نے بقول مولانا تب کی تحصیل اور آج کے ضلع بڈگام میں اپنا واضح سیاسی مستقبل ''غارت'' کیا تھا۔

۱۹۶۳ء میں کے سی ایس کا رزلٹ آیا۔ میں تحریری امتحان میں تیسری پوزیشن پر تھا اور عندیہ ملا کہ اگر انٹرویو سے پہلے جناب بخشی صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہوا اور اپنی سابقہ غلطیوں کی اُن سے معافی طلب نہ کی تو مجھے ڈراپ کیا جائے گا۔ میں نے چونکہ وکالت میں پوزیشن بنائی تھی، علاقہ میں سیاسی خلا بھی کسی حد تک پورا کیا تھا لہٰذا

ملازمت کا شوق بہت کم تھا بلکہ والدین کا اصرار بھی تھا کہ میں ملازمت کی غیر یقینیت کے مقابلہ میں پیشہ ورانہ استقامت کا مظاہرہ کروں۔ اُسی روز اتفاقاً مولانا لال چوک میں ملے اور ہم دونوں ڈائمنڈ سروس دکان پر کچھ دیر رہے۔ میں نے اپنا ماجرا سنایا تو آپ نے کچھ سوچ کر فرمایا "بحیثیت منصف آپ عدالت عالیہ کے ماتحت ہوئے مگر بحیثیت مجسٹریٹ (اُن دنوں جوڈیشل اور اگزیکٹیو اختیارات ایک ہی افسر میں ہوئے تھے) آپ ہوم منسٹری سے وابستہ ہو تو اگر کل آپ کو بحیثیت مجسٹریٹ ہوم منسٹر بلائے گا تو کیا آپ نہیں جائیں گے۔ لہٰذا آج ہی جائے اُن کا جذبۂ انتقام معقول ہے وہ خندہ بر لب ہو کر آپ کو مبارک باد دیں گے" اُسی وقت طے ہوا کہ ملاقات ہونی چاہیئے تو دفعتاً بخشی صاحب کا ایک خاص غیر سیاسی رفیق آن پہنچا جو مجھے دوسرے روز صبح بخشی صاحب کے ہاں پرائیویٹ آفس کی طرف اپنی کار میں لے چلا مگر بخشی صاحب موٹر میں سردار حکم سنگھ سپیکر پارلیمنٹ کے ساتھ پہلگام کو جا رہے تھے اور ڈار صاحب سے بہ آواز بلند کہا "پگاہ صبحائے یزِہِیتہ ان زین سیت" (کل علی الصبح آنا اس کو بھی ساتھ لانا) مگر کل صبح انٹرویو دینا تھا میرا اول نمبر ایک تھا اور برابر دس بجے اندر جانے کے لئے نو ہی بجے امر گڑھ پیلس پہنچنا تھا۔ اس طور اُسی زبانی امتحان میں حضرت بل قتل کیس اور سازش کمیٹی کی اہمیت کے وکیل کو تیسری سے دسویں پوزیشن پر دھکیل دیا گیا پھر کیا ہوا وہ نفس مضمون کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔

گو کہ ملازم بننے کے بعد میرا راستہ بدل گیا تھا مگر میرے تعلقات مولانا کے ساتھ بڑھتے ہی رہے اور اُن کی شفقت سے ہر وقت مستفید رہا۔ ایک وقت آیا کہ میں غیر معقول اور بار بار کی تبدیلیوں سے ملازمت سے دل برداشتہ ہوا تو استعفیٰ پر نوبت آئی۔ چیمبر میں اسی ارادہ سے باتوں باتوں میں مرحوم عبدالحمید قرہ ایڈوکیٹ کو معلوم ہوا۔ بہت ناراض ہوئے بہت حجت کی مگر میں اپنے فیصلہ پر اٹل رہا مگر گھر جاتے اُنہیں

لال چوک میں مولانا ملے، اُن سے کہا۔ اُنہوں صوفی غلام محی الدین کے واسطہ سے سبحان کی دکان پر بلایا۔ وہاں مجھ سے استفسار کیا اور بہت اطمینان کے ساتھ کہا "استعفیٰ کو ایک سیاسی دستاویز بنائیں گے"۔ میں خوش ہوا اور اپنا استعفیٰ اُنہیں دکھایا اُنہوں نے وہ کاٹا اور کہا "آپ کی قسمت میں پونچھ میں دانے مخصوص طور لکھے ہیں اگر آپ عزت سے بحیثیت جج نہ جاؤ گے تو یہ کھلانے کے لئے آپ کو وہاں بطور قیدی پہنچایا جاسکتا ہے۔ آپ پونچھ جایئے چارج لے کر رخصت لے کر آیئے تو پھر استعفیٰ کی سوچیں گے"۔

اس سے قبل چھ سال کی بات ہے کہ میں ۵۹ دن کا مجسٹریٹ درجہ اول بنا تھا۔ شہر سرینگر میں پہلی تعیناتی ہوئی تھی کہ کشمیر کی تاریخ نے ایک انقلابی تحریک کو جنم دیا جو موئے مقدس کی گمشدگی کی وجہ سے پیدا ہوئی اور اس خطہ کی روایات میں ایک منفرد تحریک جس نے مسلمانوں کے تمام بلکہ باہم متضاد مکاتیب فکر کو بھی اکٹھا کیا اور جو بلا لحاظ ملت و مذہب اور ذات پات کے تمام طبقات کی مشترکہ تحریک تھی۔ سب سے منظم اور تقدس سے چلائی گئی اجی ٹیشن۔ نومسلم زیادہ جذباتی مسلمان ہوتا ہے اور میں نیا جج تھا اور مجسٹریٹی کے دکھاوے کے شوق نے اسی وقوع کے روز مجھے نصف درجن مجسٹریٹوں سے پہلے عدالت کی طرف دھکیل دیا۔ اے ڈی ایم صاحب تنہا مضطرب کہ کس مجسٹریٹ کو اہم مرکز لال چوک پر تعینات کیا جائے۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور میرے تجربہ کو نظر انداز کر کے اس جونیر موسٹ کو اس شاہ رگ پر مامور کیا۔ پھر میں مجسٹریٹ کے طور تب تک براجمان رہا جب تک تحریک سرگرم رہی۔ میرا دفتر پلیڈیم ٹاکی کے منیجر کا دفتر تھا اور سیکٹر آفیسر میرے ساتھ شاید عبدالصمد خان ڈپٹی ایس پی (سابقہ آئی جی پی) تھے اور سیکٹر کمانڈر کپٹن سنگل مدراس رجمنٹ کے تھے۔ ۶ رجنوری ۱۹۶۴ء کا وہ تاریخی اجلاس اب بھی ایک فلمی ریل کے طور میری آنکھوں کے سامنے ہے گویا اس وقت بھی پلیڈیم کی کھڑکی سے اپنی آنکھوں سے لال چوک مظاہرہ کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ چوک کھچا

کھچ ایک طرف تاحدِ امیرا کدل تو دوسری طرف پرتاپ پارک تک لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے' جوان' امیر و غریب۔ محمود ایاز ایک ہی صف میں' برف بدستور گر رہی تھی۔ اجتماع کے آگے مولانا مسعودی گرتی برف میں ۴۳ منٹ کھڑا تقریر کر رہے ہیں۔ تنبیہ ہے کہ کوئی نعرہ نہ دیا جائے۔ آپ کے ہی ارشاد سے سٹیج سے ہی صرف ایک جوان والنٹیئر غلام محمد ایک ہی نعرہ دیتا ہے۔ نعرہ ہے "ہوشیار" بس خاموشی چھا جاتی ہے۔ مذکور غلام محمد کا بعد میں لقب ہی "ہوشیار خان" بن گیا۔ ہزاروں چھاتے مقرر کی آواز تمام کانوں تک پہنچنے میں مانع تھے۔ ایک والنٹیئر سٹیج پر چھاتا لے کر مولانا کو برف سے بچانے لگا کہ مولانا کو محسوس ہوا کہ چھاتے تقریر کی سماعت میں خلل انداز ہیں تو جھٹ اپنے اوپر رکھا چھاتا والنٹیئر سے چھینا اور دور پھینکا۔ بیک جنبش لگ بھگ تیس ہزار چھاتے ٹھکا ٹھک آوازوں کے ساتھ بند ہو گئے اور تا دمِ اخیر لوگ برف میں جم گئے مگر کسی ٹھٹھرتے ہوئے وجود میں حرکت نہیں۔ گویا دم بخود مبہوت تھے اور جب لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد فراغت پا کر کھڑا ہوئے تو ہر ایک شخص کندھے پر تین انچ برف کا بوجھ لے کر چلا۔ جب موئے مقدس کی بازیابی کے بعد شناخت ہو رہی تھی۔ راقم ڈی ایم خواجہ نور محمد' اے ڈی ایم مرزا سیف الدین احمد اور ڈی آئی مرحوم غلام رسول کے ساتھ ڈیوٹی پر مامور تھا۔ قحط الرجال میں جذباتی گوہر ہر محاذ کے لئے مہیار رہا۔ وہ شدت جو بازیابی کی تحریک میں تھی وہ سراسر ناپید ہوئی۔ آج تک جذباتی نظریات کے حامل افراد کی یہی مسلمہ رائے ہے کہ مولانا نے اُس عظیم تحریک کا سبوتاژ کیا۔ راقم بہت عرصہ خود اسی خیال کا تھا مگر واقعات اور تفتیش حالات نے واضح کیا کہ اگر جذباتی رویہ اختیار کیا گیا ہوتا تو ایک حضرت بل کی مرکزیت ختم ہو جاتی اور ردِ عمل کے طور ویشنو سہائے ہوم سیکریٹری اور چیف آف آئی بی نے خون کی ندیاں بہائیں ہوتیں۔ مولانا نے استفسار کرایا تھا کہ اگر بین الاقوامی مداخلت ہونے کا امکان پایا جاتا تو ایسا بھی (شاید)

ہوتا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اُس وقت بھی امریکہ برطانیہ کے دوستوں نے پاکستان کو طلائی طشت پر کشمیر دلانے کا وعدہ کیا اور اُس نازک وقت پر برصغیر کے حالات بگاڑنے سے اُس کو روکا گیا۔ بعد میں کف افسوس ملتے ہوئے ۱۹۶۵ء میں ایک خودکش، ٹیم دراندازی کر کے یہاں بھیج دی مگر جب اندرونی تحریک ٹوٹ چکی تھی اور وہ بے چارے یہاں دھکیل دیئے گئے مگر پیچھے سے اُنہیں رسد اور رابطہ بند کیا گیا۔ اُن کا حشر وہی ہوا جو خودکشی کرنے والے کا ہوتا ہے۔

حوالہ جات:

ا۔ اخبارات خدمت وصداقت: ۱۵/اپریل ۱۹۴۲ء

ب۔ تاریخِ تحریکِ کشمیر از رشید تاثیر

ج۔ حضرت بل۔ کشمیر کی تاریخوں میں۔ غلام رسول بٹ سولنہ

Hazratbal: Central Stage of Kashmir Politics.

G N Gowhar

☆☆☆

☆......جی۔آر۔صوفی

مولانا مسعودی سے کچھ یادگار ملاقاتیں

۱۹۳۱ء سے ۲۰۱۴ء تک ۸۴ سال پر محیط عرصے پر نظر ڈالئے تو ہماری ریاست ایک مفکر، دانشمند اور دور اندیش سیاست دان اور رہنما کی تلاش میں سرگرداں رہی ہے۔ ہاں میری ناقص رائے میں اگر اس معیار پر کسی حد تک ریاست کا کوئی سیاست دان اترتا تھا تو وہ مرحوم مولانا مسعودی تھے۔ مرحوم، ہمہ جہتی شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ وہ بیک وقت ایک مذہبی عالم، صحافی، استاد، تحریکی منتظم، مدبر، طولانی مقرر اور سب سے بڑھ کر اپنی نجی زندگی میں روایتی سیاست دانوں کے برعکس سادگی اور دیانت داری کے ایک درخشندہ ستارے تھے۔ مستقبل میں جب ایک بے لاگ مورخ کشمیر کے سیاست دانوں کی خصوصیات اور لوگوں کے تئیں اُن کی خدمات کا تذکرہ کرے گا تو وہ مولانا مرحوم کی سیاسی بصیرت، ان کی ذاتی زندگی میں سادگی اور انتہائی دیانتداری کا اعتراف بلا کسی جھجک کے کرے گا۔ مرحوم شیخ صاحب ''آتشِ چنار'' میں مولانا کی ان کے بقول ''شاطرانہ'' سیاست کے باوجود ان کی دیانت داری کا اعتراف کر چکے ہیں۔ مولانا کے باقی قد آور ہمعصروں پر اس ضمن میں مورخ کا قلم بے دردی سے چلے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مولانا کی جرأتِ رندانہ کی کمی کا ہے گا ہے ان کی مصلحت کوش تقاریر، ذاتی ملاقاتوں اور مجلسی گفتگوؤں میں ارادتاً گنجلک اور مبہم اندازِ بیان کا ذکر کرنے کے بغیر نہیں رہے گا۔ مولانا سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۶۷ء سے ہوا جب میں ۱۶ر سال کا تھا۔ ۱۹۶۵ء کے بعد حالات نے جو کروٹ لی اس کے تناظر میں مولانا ۱۹۶۷ء سے ہی انتخابی

سیاست کی وکالت کرنے لگے۔ مولانا کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ دورانِ گفتگو یا دورانِ تقریر رمزو کنایہ اور استعارات کی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اس وقت کی مقتدر قیادت نے ان کی انتخابی سیاست کی دلیل کو مسترد کیا۔ ان کے حامیوں نے ایک ملاقات میں ان سے پوچھا کہ مولانا اب کیا ہوگا تو انہوں نے کہا کہ ''بس تو چلی گئی'' اب یہ بس پانچ سال کے بعد لوٹے گی۔ بہت سے لوگ بس میں سوار ہونے سے منکر ہو گئے۔ یہی لوگ پانچ سال کے بعد بس پر سوار ہونے کی کوشش کریں گے لیکن ان کو بس میں سوار ہونے نہیں دیا جائے گا''۔ یہ ایک قسم کی پیش گوئی تھی جو صحیح ثابت ہوئی کیونکہ ریاستی قانون سازیہ نے ایک قانون پاس کر کے ان لوگوں پر الیکشن لڑنے پر پابندی لگا دی جو ایک خاص نظریئے کے پیرو کار ہوتے ہوئے اس سے پہلے انتخابات کے بائی کاٹ کے قائل تھے۔ بحث اس بات پر نہیں کہ مولانا کی سوچ صحیح تھی یا دوسرے لوگوں کی۔ بات صرف یہ ہے کہ مولانا کشمیر کے واحد سیاسی رہنما تھے جن کو اللہ نے آنے والے حالات اور واقعات کی بصیرت عطا کی تھی۔ وقت نے ان کی سوچ کی افادیت اور سیاسی پختگی پر مہر لگا دی۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء میں جب میں گاندربل اپنے کالج میگزین ''لالہ رُخ'' کے لئے ایک مضمون لکھنے کے لئے ان سے کچھ معلومات حاصل کرنے گیا تھا تو دورانِ گفتگو انہوں نے یہ کہا کہ پاکستان کے قائد نے ہمارے قائد کو ۴۷ء سے پہلے سے اپنی گود سے اُٹھا کر دوسروں کی گود میں ڈالا جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ مولانا' کشمیر چھوڑ دو تحریک کی ٹائمنگ کے خلاف تھے۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۴۶ء میں ایجی ٹیشن شروع کرنا جس کے نتیجہ میں قائدین کو جیل جانا پڑا سیاسی بصیرت کا فقدان تھا کیونکہ اس وقت تاجِ برطانیہ نے برصغیر کی آئندہ قسمت کا فیصلہ کیا تھا اور اب اس کے جغرافیہ اور سیاسی خدوخال طے کئے جا رہے تھے۔ ہم جو کہ ایک ایسی ریاست کے قائدین تھے جس کی سرحدیں دونوں آزاد ہونے والے ملکوں

سے ملتی تھیں باہر رہ کے نہایت ہی امن و آشتی کے ماحول میں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور وفکر کر سکتے تھے کہ ہمارے لئے کیا بہتر فیصلہ ہے۔ جیلوں میں جانے کا مطلب یہ ہوا کہ فیصلے افہام و تفہیم اور بحث و مباحثے کے بغیر فیصلے لئے گئے۔ دوسرے فریقوں نے جنگ اور سیاسی داؤ پیچ سے کام لیا۔ ۱۹۵۳ء میں مرکز اور ریاست کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوئے ان کو مولانا مسعودی افہام و تفہیم سے حل کرنے کے قائل تھے۔ دورانِ ملاقات کہا کہ جب کوئی الاؤ سُلگ جاتا ہے اگر اس کو جلدی بجھایا نہیں جائے گا تو پھر وہ ایک دہکتا ہوا تنور بن جاتا ہے۔ اس میں نتائج کی پرواہ کئے بغیر چھلانگ لگانا شعلوں میں بھسم ہونے کے سوا اور کیا ہے۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۶۷ء کے بعد آنے والے واقعات کی صحیح طور پر عکس بندی سے اخذ ہوتا ہے کہ اللہ نے مولانا کو زبردست سیاسی بصیرت عطا کی تھی۔ اسی طرح کی بصیرت کشمیر کے ایک اور مایہ ناز سپوت سورگیہ پریم ناتھ بزاز کو عطا ہوئی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں اپنی مشہور کتاب ’’The History of Struggle for Freedom in Kashmir‘‘ میں ۱۹۸۸ء سے جو واقعات کشمیر میں پیش آئے سورگیہ بزاز نے ہو بہو پیشن گوئی کی تھی۔ ان کی اس کتاب کے مندرجہ ذیل اقتباسات چشم کشا ہیں اور پڑھنے والا آنے والے واقعات کی صحیح پیشن گوئی پڑھ کے آنجہانی بزاز کی فکر اور نظر کی گہرائی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہتا۔ آنجہانی بزاز لکھتے ہیں:

"Ultimately the fate of Kashmir will be decided by its people peacefully. If India and Pakistan arrive at a settlement, by violent methods if constitutional means are denied to them for long. Today conditions in the State are explosive and faught with great danger. It will be the greatest

tragedy in the history, of the State, if violence breaks out on a large scale and the people resort to terrorist methods to wipeout despotism and corruption, it will make the immediate future of the peace loving bleak and dismal. No well wisher of Kashmiris likes to see that evil day but those who complacently believe... some day things will return to normal, are consciously or unconsiously sowing the seeds of that great tragedy. There have already been spordic attempts at violence. News about these have been deliberately suppressed. It is therefore time that all liberals, democrats and believers in peaceful progress should assert themselves"(The History of Struggle for Freedom in Kashmir by P. N. Bazaz, Page No. 614, Gulshan Books, First Edition 1954)

مجھے یاد آتا ہے کہ ۷۴ء کی اس ملاقات میں جب مولانا کو پتہ چلا کہ میں علی گڑھ میں سیاسیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے زیر تعلیم ہوں تو مجھے کہا کہ بیٹا سردار پٹیل کی کارسپانڈنس میں جموں کشمیر کے بارے میں جو خط و کتابت ہے اس کو غور سے پڑھو۔ جب میں علی گڑھ واپس گیا تو مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ یونیورسٹی میں جا کے پتہ چلا کہ یہ کارسپانڈنس کئی جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کارسپانڈنس کو ہندوستان کے ایک ممتاز صحافی شری درگا داس نے مرتب کیا تھا۔ اس وقت مجھے مولانا کی علمی عظمت کا پتہ چلا کہ وہ شخص جو کہ انگریزی میں باقاعدہ فارغ التحصیل نہ تھے ان کو انگریزی پر کما حقہ عبور تھا۔

مولانا کی علمی اور ادبی صلاحیتیں اس بات سے ظاہر ہوتی ہیں کہ وہ کشمیر کے ان چند گنے چنے زعماء میں تھے جن کا مطالعہ وسیع اور متنوع تھا۔ مرنے کے بعد ان کا ذاتی کتب خانہ بکھر گیا۔ کتابوں کی کچھ اچھی خاصی تعداد ایک صاحب نے مولانا سے اپنی قربت کا ناجائز فائدہ اُٹھا کے، وارثوں کی شرافت کی وجہ سے اپنی تحویل میں لے لی۔ وہ اس کتب خانہ تک کسی طالب علم یا ریسرچ سکالر کی رسائی کو روکنے کے لئے تمام حربے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ کتابیں ایک دینی ادارے کے پاس ہیں وہ بھی بادلِ ناخواستہ طالب علموں اور ریسرچ سکالروں کو ان کتابوں تک رسائی دیتے ہیں۔ میں نے اپنی ذاتی کوششوں سے اس ادارے میں موجود ان کی کچھ کتابوں کی فہرست حاصل کی ہے۔ فہرست دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کا حدودِ مطالعہ کتنا وسیع اور متنوع تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ مولانا کی عادت رہی ہے کہ وہ کچھ کتابوں کا مطالعہ کرنے کے دوران ان پر حواشی لکھتے تھے۔ مجھے ان تمام حاشیوں تک رسائی حاصل نہیں ہوئی پھر بھی جو اکا دکا حاشیے میری نظر سے گزرے ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کی تحریریں شستہ، سلیس اور پُر مغز ہوا کرتی تھیں۔ کتاب کے مصنف کے کسی خاص نظریئے یا بات سے اختلاف بڑی خوبی اور مدلل طریقے پر ظاہر کرتے تھے۔ مولانا شعر و سخن کا بھی اچھا خاصا مذاق رکھتے تھے۔ حالانکہ مولانا کی کوئی باضابطہ تحریر موجود نہیں ہے لیکن کچھ لوگوں کا گماں ہے کہ زندگی کے آخری برسوں میں مولانا اپنی یادداشتیں لکھتے تھے۔ اتنا بڑا لیڈر جس کو اللہ تعالیٰ نے زبان و بیان اور قلم کا ملکہ عطا کیا تھا اپنی کچھ تحریر نہ چھوڑے شبہات اور شکوک کو جنم دیتا ہے کہ شاید کچھ لوگوں نے جو ان کے قریب تھے مولانا کی ان یادداشتوں کو اپنے پاس رکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

مولانا مسعودی کا کسی حد تک مماثلت اور موازنہ مولانا عبدالکلام آزاد سے کیا

جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد بیک وقت عالم، فاضل، سیاست دان، تاریخ دان، مفسر قرآن، عبقری ذہن سیاستدان تھے۔ وہ بھی نظر شناس اور دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان کے اب جو حالات ہیں مولانا آزاد نے ان کا احاطہ اپنی مشہور کتاب India Wins Freedom میں کیا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے کچھ انٹرویوز جو لاہور کے مشہور اخبار چٹان کے مدیر مرحوم شورش کاشمیری کو دیئے۔ ان انٹرویوز میں مولانا آزاد نے آنے والے حالات و واقعات اور حادثات کی واضح تصویر کھینچی تھی جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ آج جب میں اس مضمون کی نوک پلک سنوارنے میں محو تھا تو میری نظر The Hindu اخبار پر پڑھی دیکھا کہ آج مولانا آزاد مرحوم کا یومِ وصال تھا۔ وائے حسرت مولانا آزاد کو بھی اپنی زندگی میں ہندوستانی مسلمانوں سے پذیرائی نہیں ملی۔ یہی حال مولانا مسعودی کا ہے جس طرح پرانی دلی میں آج سے کچھ وقت پہلے تک مولانا آزاد کا مرقد ویران اور خارزار بنا ہوا تھا اسی طرح مولانا مسعودی پر ہم نے ظلم کیا ہے۔ مولانا مسعودی گاندربل کے ایک مقبرے میں دفن ہوئے۔ اطلاعات کے مطابق مقبرے کے متولیوں نے مقبرہ کی بھرائی کر کے کئی قبروں کو ہموار کیا ہے جس کی زد میں مولانا کی قبر بھی ہے اور اب ان کی قبر پر لوحِ قبر بھی نہیں ہے اور قبر بالکل ہموار ہے۔ کاش ایسے دیانتدار سیاست دانوں سے اختلافات کے باوجود مرنے کے بعد کوئی پذیرائی ہوتی۔

مولانا مرحوم ایک اور سیاسی کارنامے سے بھی جانے جائیں گے وہ یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد کشمیر کی نئی سیاسی لیڈر شپ خاص کر ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور مرحوم میر واعظ فاروق کی سیاسی تربیت کی ہے۔ میں نے چشم دید گواہوں سے سنا ہے کہ مرحوم پیر افضل مخدومی جو ہمارے پڑوس میں رہتے تھے اور تحریک حریت کے ایک ممتاز رہنما رہے ہیں ان کے گھر میں مولانا کا آنا جانا تھا۔ موئے مقدس کی تحریک کے دوران سرکاری اور

پرائیویٹ ٹرانسپورٹ بند تھا' اسی لئے پیر افضل صاحب کا گھر ایک سٹریٹجک لوکیشن ہونے کی وجہ سے مولانا جامع مسجد' حضرت بل اور مجاہد منزل جاسکتے تھے۔اسی گھر میں مولانا جوان لیڈرشپ کے ایک صاحب کو ایک بڑے آئینے کے سامنے کھڑا کر کے تقریر کرنے کی مشق کرواتے تھے۔ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی وضع داری کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مولانا کی زندگی کے آخری دنوں میں کشمیر ہاؤس میں ان کی تیمارداری اور علاج ومعالجہ کا خاص خیال رکھتے تھے۔حالانکہ ان کے قد آور والد کی مولانا نے ان کے اقتدار کے آخری برسوں میں کافی مخالفت کی تھی۔ڈاکٹر صاحب کی یہ روایت قابل تحسین ہے کہ سیاست دانوں کو سیاسی اختلافات کی حد سیاست تک ہی محدود رکھنی چاہیئے۔سماجی تعلقات پر ان کا اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔وضع داری کا ظرف وسیع وعریض ہو سیاسی قوتِ برداشت کا اتھاہ سمندر ہماری اس وادی گلپوش میں اپنی وسعت اور گہرائی کے ساتھ ہے۔آمین

☆☆☆

☆......رشید احمد مسعودی

وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے

مولانا مسعودی کی زندگی پر لکھنے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ اُس زمانے کے سیاسی حالات اور مولانا کے آبا واجداد کے متعلق تمہیداً تذکرہ کیا جائے۔ کشمیر کی آزاد مملکت پہ مغلوں نے غلبہ پا کر کشمیریوں کو محکوم بنایا۔ پٹھانوں اور سکھوں کے مظالم سب کو یاد ہے اور پھر لاہور دربار کی پامالی کے بعد گلاب سنگھ اور اس کے وارثین نے حکومت کی۔ ہمارے شیرازۂ اتحاد کو بکھیرنے کے لئے وہ حربے استعمال کئے گئے کہ بعض یورپین مورخین کو یہ کہنا پڑا کہ اس سخت جان قوم کا ان مظالم کے بعد جواُن پر توڑے گئے' زندہ رہنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ تین صدی سے زائد غلامی کے خلاف جنگ لڑتے لڑتے ۱۹۳۱ء میں کشمیر کے غیور عوام گولیوں سے چھلنی ہو کر اپنے پائے استقلال پہ ثابت قدم رہ کر جاگیردارانہ نظام ظلم وستم کے خلاف صف آرا ہوئے۔ اوروں کی طرح مولانا بھی کاروانِ حریت میں شامل ہوئے۔

جہاں تک مولانا کے آبا واجداد کا تعلق ہے' مغلوں کے تسلط سے قبل' دسویں ہجری میں کشمیر میں چک خاندان کا راج تھا۔ کشمیر کی تاریخی کتابوں کا اس بات پہ اتفاق ہے کہ مولانا مسعودی کے جدِ امجد حضرت بابا مسعودؒ اپنے زمانے کے اتنے بڑے تاجر تھے کہ ان کو ''ملک التجار'' یعنی تاجروں کا سردار کہا جاتا تھا اور بادشاہ وقت علی شاہ نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دی تھی۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی کتاب میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ حضرت بابا مسعودؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے خاندان سے تھے

اور بابا مسعودؒ کے باپ دادا کوفہ سے بغداد' بغداد سے ملتان' ملتان سے لاہور اور لاہور سے سرینگر آئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے والد ثابتؒ بن زوطی نے عید کے روز حضرت علیؑ کو کوفہ میں ''فالودہ'' پیش کیا اور حضرت علیؑ نے ثابتؒ اور ان کی اولاد کے حق میں برکت کی دعا کی تھی۔

۹۵/ہجری کے آس پاس بابا مسعودؒ دنیا و دولت سے تنگ آ کر روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے جڈی بل کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک بزرگ نے آپ کو جڈی بل جانے سے روکا۔ پھر آپ نے بلبل لنکر جہاں حضرت سید شاہ احمد کرمانیؒ تشریف فرماتے' سے فیض حاصل کر کے روحانی درجات طے کئے اور بعد میں خلافت کے درجہ کو پہنچ گئے۔ آپ کے ایک پڑپوتے بابا عریف اللہ لولاب میں مقیم تھے' سکھوں کے ظالمانہ برتاؤ سے تنگ آ کر وادی لوات میں جا کر آباد ہو گئے۔ وہاں ان کے پانچ بیٹے ہوئے جو پڑھ لکھ کر تبلیغ کرتے رہے۔ پیر احمد شاہ ابن صالح زمینداری اور پیری مریدی میں مصروف ہو گئے۔ پیر احمد شاہ کی پانچ اولادیں ہوئیں اور سب سے بڑے مولانا محمد سعید مسعودی تھے۔ مولانا انور شاہ' مولانا فیروز شاہ (اٹک کا قیدی)' غلام محی الدین شاہ' نذیر احمد مسعودی۔

موضع لوات نیلم میں ماہ شوال ۱۳۲۱ھ (۲۵/جنوری ۱۹۰۳ء) پیر احمد شاہ کا پہلا بیٹا ہوا جس کا نام محمد سعید رکھا گیا۔ اس زمانہ میں علاقہ بھر میں کہیں اسکول کا وجود نہ تھا۔ محمد سعید کے اوّلین استادان کے ماں باپ تھے۔ قرآن پاک اور فارسی کی کتابیں والد اور والدہ محترمہ نے پڑھائیں۔ بعض اسباق اپنے عم مولوی مختار اور اپنے نانا پیر لسہ شاہ اور اپنے ماموں پیر عبدالجبار شاہ سے بھی پڑھے تھے۔ لوات سے قریب ایک دوسرے گاؤں کٹھ پیران میں ایک درسگاہ تھی جس میں مولوی ظہور الحق اور مولوی اسرائیل فاضل دیوبند درس دیتے تھے' جن سے صرف ونحو اور فقہ کی بعض کتابیں

پڑھیں۔ تعلیم کی دوسری منزل ضلع ہزارہ کے مانسہرہ، داتہ اور بھوئی گاڑن کی درسگاہیں تھیں جن کے بعد لاہور کا رُخ کیا اور اچھرہ کے مدرسہ قمریہ اور لاہور کے مدرسہ نعمانیہ سے منطق و فلسفہ اور فقہ و اصول کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۳ء/۱۳۴۰ھ میں اورینٹل کالج لاہور کے درجہ مولوی فاضل میں شامل ہوئے اور ۱۹۲۴ء وہاں سے پنجاب یونیورسٹی سے ممتاز درجہ پاکر تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ ۱۹۲۵ء میں واپس وطن آکر مشاغل زندگی شروع کی۔ ۱۹۲۷ء میں مظفرآباد ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۲۸ء میں پرنس آف ویلز کالج جموں میں اورینٹل لنگویجز کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں سے سرینگر ایس پی کالج میں تبدیل ہوئے۔ ۳۱۔۱۹۳۰ء ہری سنگھ ہائی اسکول رعناواری سرینگر میں صدر مدرس کی حیثیت سے تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد فروری ۱۹۳۲ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کشمیر کی تحریکِ آزادی سے وابستگی اختیار کر کے سنٹرل جیل کی راہ لی۔ بقول ان کے یہ سیاست کا نشہ کچھ اس طرح سے سر پر سوار ہوا کہ ہمیشہ سیاست سے چپک کر رہ گئے۔

سنٹرل جیل سرینگر میں جناب شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد سے ملاقات ہوئی اور ۲۸رمئی ۱۹۳۲ء کو آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد وہیں سنٹرل جیل میں ڈالی گئی۔ بخشی صاحب اور شیخ صاحب کے اصرار پر مسلم کانفرنس کا آئین اور تنظیم آپ کی ذمہ داری رہی۔ اس طرح ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک مسلم کانفرنس اور سن ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۳ء تک نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری رہے۔ کشمیر کا شاید ہی کوئی ایسا پرائم منسٹر ہوگا جس کے زمانہ میں آپ جیل نہ گئے ہوں۔ ۱۹۵۳ء میں بخشی صاحب کے زمانے میں ۳ سال، صادق صاحب کے زمانے میں ساڑھے تین سال، قاسم صاحب کے زمانے میں دو ماہ اور شیر کشمیر کے آخری زمانہ میں ڈاکٹر بشیر صوفی کے مکان کی منہدمی کے وقت تقریباً پانچ گھنٹہ محبوس رہے اور جنتا پارٹی کی ہار کے بعد جب

Forest Lodge کو سیل کیا گیا' تقریباً تین ماہ آپ کی ذاتی اشیاء اور سوٹ کیس بھی سر بمہر ہے۔

۱۹۳۲ء سے مولانا صاحب کے لئے تحریک حریت زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ یہ بات ذہن نشین کرنی ہے کہ مولانا کی لاہور میں دورانِ تعلیم پیر عبدالغفار صاحب (جوتر گہ پورہ) سے وابستگی' حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد انور شاہ کشمیری' امام العصر دیو بند کے رشتہ کی وجہ سے لاہور کی مجلسوں میں شرکت کی۔ مولانا کا تعلق خاص حضرت حکیم الامت ڈاکٹر سر محمد اقبال' اخبار زمیندار کے مولانا ظفر علی خان' شعلہ بیان مقرر مولانا عطا اللہ شاہ بخاری' کشمیری نژاد مولانا سید میرک شاہ اندرابی وغیرہ سے استوار ہوا اور کشمیر کی حالتِ زار قلمی نام "ابو بشیر" کے ذریعہ لاہور وغیرہ میں اخبار "زمیندار" میں کالم لکھ کر پہنچاتے رہے اور ایک وجہ یہ بھی سرکاری نوکری چھوڑنے کی بنی۔ ایس پی کالج اور رعناواری ہائی اسکول کے دوران تحریک کے ابتدائی محرک حضرات نے ریڈنگ روم وغیرہ سے مولانا کو "تحریک حریت کشمیر" سے جوڑ دیا اور یہ رشتہ ۱۳/دسمبر ۱۹۹۰ء تک ہر حال میں قائم رہا۔

حضرت علامہ اقبالؒ کا شیر کشمیر کے نام ۱۹۳۲ء کا خط بھی مولانا کے ذریعے ہی کشمیر کی تحریک کی تائید میں پہنچا۔ ۱۹۳۴ء میں مولانا صاحب کو ایک جوشیلی تقریر اور چارٹر مطالبات پڑھ کر سنانے کی پاداش میں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور قید اور بھاری جرمانے کی سزا ہوئی۔ (اس جلسہ میں والنٹیر وردیاں پہن کر اور بستر ساتھ لے کر خانقاہ معلیٰ میں لگ بھگ ۵۰ ہزار کے قریب جمع ہوئے)۔ جرمانہ وصول کرنے کے لئے مولانا کے والد پیر احمد شاہ مسعودی اور چچا پیر قاضی احمد شاہ مسعودی جو اُن کے سسر تھے' کا اثاثہ منقولہ وغیر منقولہ ضبط کیا گیا۔ اسی مقدمہ میں علی محمد طارق پہ بھی مقدمہ چلا اور سزا اور جرمانہ ہوا۔ طارق صاحب نے ولدیت مولانا مسعودی کی لکھوائی تھی۔

گورنمنٹ نے طارق صاحب کے جرمانہ کو وصول کرنے کے لئے پھر دوسری بار جائیداد قرق کی۔ بعد میں دونوں جرمانے پیر قاضی احمد شاہ صاحب نے ادا کئے۔ جرمانہ کی رقم ۳۴۰۰ روپے درج ہے۔

۳۸۔ ۱۹۳۷ء میں پرجا سبھا کا انتخاب ہوا۔ مسلم کانفرنس نے مولانا صاحب کو مظفر آباد حلقہ سے نامزد کیا۔ ان کا مقابلہ پیر حسام الدین جاگیردار سے ہوا۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے مولانا صاحب کے حق میں الیکشن مہم چلائی اور دودتیال سے مظفر آباد کبھی گھوڑوں، کبھی پیدل گاؤں گاؤں گھومے اور مولانا نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ قومی مطالبہ ایجی ٹیشن میں حصہ لینے کی پاداش میں آپ کو نہ صرف قید کی سزا ہوئی بلکہ آپ اسمبلی کی نشست سے پانچ سال کے لئے برطرف کئے گئے۔ اس ضمنی انتخاب پہ پھر مقابلہ پیر حسام الدین جاگیردار سے ہوا۔ اب کی بار مولانا غلام مصطفیٰ مسعودی مسلم کانفرنس کی ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔

۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا۔ آپ کو جنرل سکریٹری چنا گیا۔ نیا کشمیر کا مسودہ بھی آپ نے ہی تیار کیا۔ ۴۵۔۱۹۴۴ء میں مسلم کانفرنس نیشنل کانفرنس کے اتحاد کے بارے میں آپ کو اور صادق صاحب کو محمد علی جناح سے ملاقات کے لئے روانہ کیا گیا۔ صادق صاحب کی علالت کی وجہ سے آپ کو اکیلے قائد اعظم سے ملاقات اور شیخ صاحب اور جناح صاحب کی ملاقات کا پروگرام طے کرنے کے لئے جانا پڑا اور جناح صاحب نے نیشنل کانفرنس کی دعوت پر کشمیر آنا منظور کیا۔

۱۹۴۶ء میں جب کوئٹ کشمیر کی تحریک شروع ہوئی تو آپ نے نہ صرف اپنے جرم کا اقبال کیا بلکہ استغاثہ کی خامیوں کو اپنے خلاف بیان کر کے سزا کے فیصلہ کو ہموار کیا۔ جیل میں قیدیوں کے ساتھ تشدد، ناقص غذا وغیرہ کے خلاف بھوک ہڑتال کر کے جیل سدھار کروایا۔ اس بھوک ہڑتال میں آپ نے پانی بھی ترک کر دیا۔ سزا کاٹنے

کے لئے آپ کو سرینگر سے مظفر آباد جیل منتقل کیا گیا جہاں آپ اکتوبر ۱۹۴۷ء تک قید میں رہے۔ رہائی کے بعد سرینگر آئے۔ ''کشمیر چھوڑ دو'' کے قیدیوں کے اعزاز میں موجودہ اقبال پارک میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ آپ نے پارٹی کو مشورہ دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کی مملکتوں کے وجود میں آنے سے ریاست کشمیر کے مستقبل کے لئے جلد بازی سے کوئی فیصلہ نہ لیا جائے۔ پارٹی کی قیادت نے آپ کے اس مشورے کو نظرانداز کرتے ہوئے آپ کو اسٹیج پر زبردستی بٹھایا۔

جب قبائلی حملہ ہوا تو آپ نے پارٹی کے فیصلہ کے مطابق افواج کی رہبری کرتے ہوئے اپنی زندگی کی پرواہ نہ کی اور نتہ نوسہ کے مقام پر شدید زخمی ہوئے۔ برگیڈئیر ہربخش سنگھ کی بروقت ہمت سے بچ نکلے۔ کافی علالت کے باوجود اپنی ذمہ داری کو انجام دیتے رہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل جموں وکشمیر پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ اختیار میں تھا۔ تقسیم ہند سے کشمیر کا تعلیمی ڈھانچہ تباہ ہو گیا اور یونیورسٹی امتحانات نہ ہو سکے۔ مولانا صاحب نے دوسری تنظیمی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ پہلا قدم یونیورسٹی کے قیام کے لئے اُٹھایا۔ خواجہ غلام احمد عشائی کے ساتھ University Ordinance کی تیاری میں مثبت اقدام اُٹھا کر جموں وکشمیر یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا۔ اس کا دفتر لال منڈی میں قائم کیا گیا۔ جسٹس قاضی پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی لائبریری کے لئے جب بات آئی تو آپ کی کوششوں سے ہندوستان سے ٹرکوں کے ٹرک بھر کر کتابیں لائبریری کے لئے لائی گئیں۔ ان میں ایسی نادر کتابیں بھی آئیں جن کی دوسری کاپی ہندوستان بھر میں نایاب تھی۔ جہاں یونیورسٹی مروجہ تعلیم کے لئے قائم کی گئی وہاں اسلامی تعلیم کے لئے ''مدینۃ العلوم'' زیر قیادت مولانا عبدالکبیر رینہ فاضل دیوبند قائم کروایا اور اس ادارے کے لئے بھی نادر کتب دہلی اور ہندوستان کے باقی کتب خانوں

سے حاصل کی گئیں۔آپ نے دارالعلوم کے چندہ کے لئے عوام سے درخواست کی تو کے۔ایم۔ڈی۔اے نے چندہ کی پیشکش کی تو آپ نے ان کو کتابوں کی فہرست سونپ دی جو انہوں نے خرید کر دارالعلوم کو وقف کر دیں۔ان میں سے تقریباً تین ہزار نایاب کتابوں پر وقف کردہ KMDA لکھا ہوا تھا۔آپ جموں وکشمیر یونیورسٹی کے ڈین آف اسٹوڈنٹس ویلفیئر کے علاوہ ڈین آف اورینٹل لنگویجز بھی ۱۹۵۳ء تک رہے اور بحیثیت ڈین یونیورسٹی کے پہلے کنووکیشن میں ڈائس پہ براجمان تھے۔آپ اکثر دارالعلوم میں درس بھی دیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء منقطع ہوا۔

آپ سیاست کے علاوہ ادبی محفلوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے رہتے۔بقول ٹینگ صاحب ”جب شیخ صاحب کی پہلی وزارت میں مسائل پیدا ہوئے تو مہجورؔ نے ”گل لالہ“ اور ”آزادی“ جیسی طنزیہ نظمیں تحریر کیں اور اس کے باوجود شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد ان کی تعظیم کرتے رہے۔جب نیڈوز ہوٹل میں کل ہند اُردو مشاعرے کا اہتمام ہوا، جس میں جوش ملیح آبادی جیسا نامور شاعر شریک ہوا تو مولانا مسعودی کی تجویز اور شیخ محمد عبداللہ کی تائید سے مہجورؔ کو مشاعرے کی شاہ نشیں پر فائز کیا گیا۔خود مہجورؔ صاحب محمد امین کو لکھتے ہیں:

”میں آپ سے رخصت ہو کر پلوامہ سے شام کو سرینگر پہنچا، کھانا کاظمی صاحب کے گھر کھایا۔رات نو بجے نیڈوز ہوٹل ہال میں شاملِ مشاعرہ ہوا۔مشاعرہ صرف اُردو زبان میں ہوا۔مشاعرے کی صدارت راقم نے بہ تحریک مولوی سعید اور بہ تائید شیخ صاحب قبول کی“۔(شیرازہ ۳۲۵،۳۲۴)۔

رعناواری ہائی اسکول میں جب آپ مدرّس تھے تو وہاں مسٹر فوطیدار ہیڈ ماسٹر تھے۔فوطیدار صاحب، مولانا سے عربی و فارسی پڑھتے اور مولانا صاحب فوطیدار سے انگریزی۔اس دوران ۱۶رجون ۱۹۴۹ء سے آپ اور شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ،

جموں سے موتی رام بیگڑہ ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوئے۔ ۳۱را کتوبر ۱۹۵۱ء آپ کو ریاستی کانسٹی چیونٹ اسمبلی کا عارضی صدر چنا گیا اور یکم نومبر ۱۹۵۱ء تک آپ نے اسمبلی کی کاروائی کی صدارت کی۔ آپ مارچ ۱۹۵۲ء کو کانسٹی چیونٹ اسمبلی کے ممبر رہے۔ اس کے بعد آپ کو جموں وکشمیر کی طرف سے ''لوک سبھا'' کے لئے چنا گیا۔ اس ضمن میں آپ کے متعلق ممبرانِ قانون سازیہ کے خیالات قابلِ ذکر ہیں:

میں یہاں سید میر قاسم صاحب کے تاثرات اگر پیش نہ کروں تو نا انصافی ہوگی:

''مولانا محمد سعید مسعودی صاحب کے ساتھ میرے بڑے بھائی محترم سید حسین صاحب نے ۱۹۴۵ء میں اس وقت میرا تعارف کرایا جب میں ابھی علی گڑھ میں ہی زیر تعلیم تھا۔ اس وقت سید صاحب نے مولانا کو صرف اتنا بتایا کہ یہ لڑکا علی گڑھ میں پڑھتا ہے اور یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ آپ کی دعائیں اس کے شاملِ حال رہنی چاہئیں۔ آگے چل کر پھر میں ۱۹۴۶ء میں کوئٹ کشمیر تحریک میں جب گرفتار ہو کر سرینگر سنٹرل جیل پہنچا تو مسعودی صاحب اور بہت سے دوسرے کانفرنسی زعماء پہلے سے وہاں جیل میں موجود تھے۔ اس قید میں ان کو دیکھنے اور پرکھنے کا قریب سے مزید موقعہ ملا۔ جب رہائی کے بعد میں نیشنل کانفرنس میں کام کر رہا تھا تو مولانا اس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اس طرح ۱۹۴۶ء سے برابر میرا اُن کے ساتھ تعلق قائم رہا اور آج تک یہ تعلق قائم ہے۔ میں وقتاً فوقتاً ان سے ملتا رہتا ہوں۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

اس میں شک نہیں کہ مولانا مسعودی صاحب نہایت عظیم مفکر ہیں اور آپ نے اپنے کام کرنے کے لئے کچھ اصول مقرر کر رکھے تھے جن پر آپ سختی سے کاربند رہتے تھے۔ آپ پیش آمدہ مسائل میں جذباتیت کے بدلے گہری سوچ رکھتے تھے۔

آپ بڑے عالم و فاضل، چوٹی کے انشا پرداز اور بے مثال مقرر تھے۔ کشمیر کی سیاست کے نشیب و فراز میں آپ کا نمایاں رول رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی ان کا رول ختم نہیں ہوا۔

مولانا کو دیکھ کر شاعرِ مشرق اقبالؒ کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا ہے ؎

ہوا ہو گو تند و تیز لیکن، چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ"

اس سے قبل میں آگے بڑھوں یہاں مولانا صاحب کی چند تقاریر کا حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں:

راج کوٹ ڈے:

راج کوٹ اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے مگر وہاں کے لوگ بھی ہماری طرح ذمہ دار نظام حکومت کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ فی زمانہ اگر پتھر، ریت، دریا، درخت اور حیوان آزادی سے زندگی بسر کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ریاستوں کے باشندوں کو ذمہ دار نظامِ حکومت حاصل کرنے اور آزادی سے زندگی بسر کرنے کی آزادی نہ دی جائے۔

تری پورہ کانگریس سیشن کی صدارت شیخ محمد عبداللہ نے کی۔ مولانا صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا "ہندوستان کے راجوں اور نوابوں کی جماعت چیمبر آف پرنس آٹھ کروڑ ریاستی باشندوں کو دبائے رکھنے کے لئے باہمی اتحاد کر رہے ہیں۔ آٹھ کروڑ انسانوں کا فرض ہے کہ وہ بھی متحدہ ہو جائیں اور تمام والیانِ ریاست سے صرف ایک ہی مطالبہ ذمہ دار نظام حکومت کریں۔

کوئٹ کشمیر تحریک کے دوران مولانا صاحب نے عدالت میں کہا:

"میرے ۵/جولائی کے پروگرام میں اپنے ان اعمال کے لئے سزا

لڑکھڑاتی ہوئی نظام حکومت کی طرف سے میرے ارادی اقدامات کے لئے تجویز ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اگر میں اپنے اقدامات کی پاداش میں ملنے والی سزا سے بچنے کی کوئی ہلکی سی کوشش بھی کروں تو وہ اپنے محبوب فرائض سے بے وفائی ہوگی"۔

اس ضمن کی تجاویز:

ا۔ ہم باشندگان جموں و کشمیر مطلق العنان حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

۲۔ ہم مہاراجہ ہری سنگھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے تئیں راجہ ہونے کا عوام سے رائے شماری کے ذریعہ تائید کرائیں۔ اگر اکثریت نے اُس کے خلاف ووٹ دیا تو وہ فوراً تخت سے دستبردار ہو جائیں۔ بصورت دیگر ہمارا مطالبہ ہوگا کہ وہ صرف آئینی حکمران رہیں گے۔

۳۔ یہ اجتماع بیعہ نامہ امرتسر کی مذمت کرتا ہے اور ڈوگرہ خاندان کی اس کی بنا پر قائم شدہ حقِ حکمرانی کو غاصبانہ تسلط تصوّر کرتا ہے اور بیعہ نامہ کی تنسیخ کا مطالبہ کرتا ہے۔

قیامِ لاہور کے دوران آپ علامہ حکیم الامتؒ مولانا ظفر علی خان، مولانا سید مبارک شاہ اندرابی، مولانا سید عطا اللہ بخاریؒ احرار حضراتؒ کے حلقہ احباب میں شامل تھے تو دہلی میں مولانا آزادؒ ڈاکٹر سید محمود، پروفیسر ہمایوں کبیر، رفیع احمد قدوائی، مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مفتی کفایت اللہ، حکیم الاسلام قاری محمد طیب، امام جامع مسجد دہلی قاری ادریس، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حفظ الرحمان سوہاروی ایم پی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا علی میاں ندوی وغیرہ سے نزدیکی مراسم تھے۔ اسلامی ممالک کے ڈیلی گیشن میں آپ کو خاص طور مدعو کیا جاتا۔ امام جامع مسجد ہند مولانا عبدالحمید بخاری آپ کے بڑے قدردان تھے۔ شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد آپ نے جنرل شاہنواز خان، رفیع احمد قدوائی، میر دولا سارا بھائی، جے پرکاش نارائن وغیرہ سے مل کر شیخ

صاحب کو رہا کرانے کی کوشش برابر جاری رکھی۔

۱۹۵۶ء حج بیت اللہ کے دوران آپ رابطہ اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے اور شاہ عبدالعزیز کو عرفات میں سایہ کے لئے درخت اُگانے کی تجویز پیش کی جو نہ صرف منظور کی بلکہ میدان عرفات میں درخت باہر کے ملکوں سے ماہرین کی نگرانی میں لگائے گئے۔ پارلیمنٹ سے واپسی پہ آپ گاندربل میں سکونت پذیر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے موقع پر ہندوستانی ایم پی اور شخصیات کو خط لکھنے کی پاداش میں گرفتار ہوئے اور حضرت بل قتل کیس میں ملوث کئے گئے۔

اسپیشل عدالت کے سامنے حضرت بل قتل کیس کے مبینہ ملزم مولانا محمد سعید مسعودی کے بیان سے چند اشعار۔

حال دل گر نظر نہیں آتا
یوں بھی اے چارہ گر نہیں آتا
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے میری جاں جگر کس کا ہے

اپنے بیان کے آخر میں کہا "زندہ رہنا ضروری ہے اس آسمانی صداقت وہدایت کا جس کا نور جب انسانوں کے دل ودماغ کو روشن کرتا ہے تو انسان کو حیوان پہ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

زندہ رہنا ہے عدل والنصاف' اخوت' مساوات' محبت اور ہمدردی کے اصولوں کا جن پر سوسائٹی کا امن وامان اور ترقی ومسرت اور سب سے بڑھ کر انسانی نجات منحصر ہے۔

زندہ رہنا ضروری ہے خطہ کشمیر کا جو ہمیشہ علم، عقل اور روحانی اقدار کا گہوارہ رہا

ہے اور زندہ رہنا ضروری ہے فرزندانِ کشمیر کا جو آباواجداد کے علمی، عملی اور روحانی کمالات کے سچے وارث اور جانشیں بن سکتے ہیں۔

انوکھا تحفہ:

مولانا صاحب کسی بھی نشہ کے عادی نہ تھے۔ جب پاکستان گئے تو وہاں تحائف رکھے گئے۔ وفد کے لوگوں نے اپنے مقدور کے مطابق تحائف دیئے۔ جب صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب نے مولانا سے اصرار کیا تو مولانا نے ایک لائٹر کی طرف اشارہ کیا۔ جب ایوب خان نے مولانا سے کہا کہ آپ تو سگریٹ نہیں پیتے۔ یہ لائٹر کس لئے؟ تو مولانا صاحب نے کہا یہ آپ کے دوست خواجہ محی الدین قرہ صاحب کے لئے ہے۔

دوران قید ومقدمہ ٹی بی کا مرض لاحق ہوا۔ مولانا حفظ الرحمان ایم پی ملاقات کے لئے ٹی بی اسپتال گئے۔ واپسی پہ سیدھے پنڈت نہرو سے مل کر مولانا صاحب کی رہائی اور علاج کے لئے احتجاج کیا۔ دہلی میں علاج کے لئے گئے۔ ساتھ ہی سازش اور قتل کے متعلق ہندوستان کی حکومت کو آگاہ کیا۔ کامراج پلان ہوا۔ واپسی پہ پھر گاندربل میں سکونت پذیر تھے کہ سانحۂ موئے مقدس ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۳ء کو پیش آیا۔ تحریک موئے پاکؐ میں باوجود علالت کے حصہ لیا۔ موئے پاکؐ بازیاب ہوا اور شناخت کرائی۔ اس طرح حضرت بل کی مرکزیت بحال ہوئی۔ قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ کے ساتھ ساتھ "مسئلہ کشمیر" سے متعلق شیخ صاحب کو رہا کر کے ہندوستان وپاکستان کے درمیان امن کا پُل بنانے کی کوشش کی۔ پنڈت نہرو کی بے وقت موت نے مسئلہ کھٹائی میں ڈالا۔ ۱۹۶۵ء/۱۹۷۱ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دو جنگیں ہوئیں۔ آخر ۱۹۷۵ء میں عنانِ حکومت شیخ صاحب کو سونپ دی گئی۔ ۱۹۷۷ء میں کانگریس کی ہار ہوئی۔ یہاں کی کانگریس نے شیخ صاحب پہ عدم اعتماد کر کے اپنی ناؤ بھنور میں ڈالی۔ مولانا

صاحب کو شری جے پرکاش نارائن نے مجبور کر کے جنتا کی قیادت حوالہ کی۔ مولانا صاحب نے ''مسئلہ کشمیر'' حل کرنے کی شرط پر قیادت قبول کی۔ لوگوں نے ووٹ ڈال کر شیخ صاحب کو اعتماد دیا۔ جنتا پارٹی مولانا کی قیادت میں اگرچہ ہار گئی مگر یہاں کے عوام کو فیصلہ کرنے کی ترغیب ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں راولپنڈی روڈ کھولنے کی تجویز رکھی گئی تھی۔ پنڈت نہرو کی بے وقت موت نے ٹال دی۔ جناب اٹل بہاری واجپائی جو ۱۹۷۷ء میں وزیر خارجہ تھے اور جنتا پارٹی کے مینوفسٹو انچارج تھے نے یہ تجویز دہرائی۔ آخر ۲۰۰۵ء میں سرینگر مظفر آباد روڈ پر ٹریفک بحال ہوا۔ لیکن پھر بھی ''ہنوز دلی دوراست''۔

☆☆☆

☆......صدرالدین مجاہد

تحریکِ آزادی کے رہنما......مولانا مسعودی

مجھے جموں و کشمیر کی جدو جہد آزادی میں قربانیاں دینے اور جیل کی سختیاں برداشت کرنے والے اُن ساتھیوں کی سیاسی زندگی کے بارے میں، اُن کی وفات کے بعد "یادِ رفتگاں" کے زیرِ عنوان مختلف اخبارات میں لکھنے کا موقعہ ملا۔ اس کا صرف یہ مقصد تھا آنے والی نئی نسل اُن مجاہدین آزادی کی زندگی سے واقف ہو۔ اگر چہ وہ بزرگ یا عزیز ساتھی داغِ مفارقت دے گئے لیکن اُن کی یاد میرے دل سے کبھی نہ مٹی اور نہ مٹ سکتی ہے۔ ہماری تحریک آزادی میں صفِ اول کے جو رہنما تھے وہ یکے بعد دیگرے اس دنیا سے چلے گئے۔ اُن میں کچھ تو ریاست میں اور کچھ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں انتقال کر گئے۔ اب صرف چند ایک اُن پرانے ساتھیوں میں سے موجود ہیں جن کی صحت اب جواب دینے لگی ہے۔

آج جس شخصیت کے بارے میں لکھ رہا ہوں اُن کے متعلق وفات کا لفظ لکھنے سے میرے ہاتھ تھر تھراتے ہیں۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میری مراد مولانا محمد سعید مسعودی سے ہے۔ میں نے تحریک آزادی میں جو بولنا، لکھنا یا جرأت مندی سے آگے آنا سیکھا ہے۔ وہ سب مولانا مسعودی کے طفیل مجھے حاصل ہوا ہے۔ خدا کا کرنا تھا میں نے زندگی کا اکثر حصہ تحریک آزادی کے لئے گھر بار چھوڑ کر مجاہد منزل میں گزارا۔ اُس وقت وہاں بابائے قوم شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد، شیر گاندربل غلام محمد بٹ گاندربلی

اور مولانا محمد سعید مسعودی بھی مستقل طور رہائش کرتے تھے اور مجھے یہ موقعہ مل ملا کہ میں وہاں ٹھہر کر سیاسی تربیت پاسکوں۔ میرے علاوہ حکیم غلام محی الدین اور عبدالغنی ترالی صاحب بھی وہاں مقیم تھے۔ میری زندگی میں مولانا مرحوم کی شاگردی میں رہ کر سیاسی تربیت حاصل کرنا لکھا تھا۔ میں نے اپنی ۲۰ رسالہ حراستی زندگی میں کافی وقت مولانا مسعودی کے ساتھ مختلف جیلوں میں گزارا اور اُن سے تربیت لیتا رہا۔ ۱۹۳۴ء میں جب میری عمر شاید ۱۳ رسال کی تھی، مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت نے مجھے باغی قرار دے کر مولانا مسعودی، اُن کے برادر غلام مصطفےٰ مسعودی، میر واعظ مولانا احمد اللہ ہمدانی، ایم اے صابر، محمد عبداللہ شیخ اور راقم کو جلاوطن کیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لاہور میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے ہاں جب بھی ہم جلاوطنوں کو وہ اپنی قیام گاہ پر بلاتے تھے وہ شیخ محمد عبداللہ کی کافی تعریف کرتے تھے اور مولانا مسعودی کی عزت کرتے تھے۔ میں نے دیکھا روزنامہ ''زمیندار'' کے ایڈیٹر علامہ ظفر علی خان کئی بار مولانا کو دیکھ کر کھڑے ہو کر مصافحہ کرتے تھے اور مختلف جماعتوں کے سیاسی لیڈر اور بڑے بڑے اخبارات کے مدیر اور دوسرے لوگ مولانا سے کافی احترام سے پیش آتے تھے۔ جب کشمیر میں ۱۹۳۴ء میں نوجوانوں کی تحریک چلی تو ایک دن ایسا آیا کہ ہم سب جلاوطن، علامہ اقبالؒ کے ہاں بلائے گئے۔ شیر کشمیر ہم سے پہلے ہی پہنچے تھے۔ آخر علامہ اور شیخ صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ ہم جلاوطنوں کو ایک ایک، دو دو کر کے واپس قانون توڑ کر کشمیر جانا چاہیئے اور گرفتاری کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق مولانا مسعودی اور میں نے یہ فیصلہ لیا کہ ہم دونوں قانون توڑ کر واپس جائیں گے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں گے۔ یہ فیصلہ ہم نے علامہ اقبالؒ اور شیخ صاحب کے سامنے لیا۔ اس کے بعد چند دن گزرنے کے بعد مولانا مسعودی اور میں لاہور سے بہت مشکل سے پولیس اور سی آئی ڈی سے چھپ چھپا کر کشمیر کی طرف روانہ

ہوئے۔ پہاڑی سفر دو دن اور دو راتیں طے کر کے کشمیر پہنچے۔ خانقاہ معلیٰ میں پہلے جمعہ کو میں نے اور دوسرے جمعہ کو مولانا مسعودی نے تقریر کی اور پولیس نے ہمیں حراست میں لیا۔ مقدمہ چلتا رہا اور سزا ہوئی اور جیل میں کافی دیر تک میں اُن کے ساتھ ہی رہا۔ اس طرح مجھے جیلوں، جلاوطنی اور دفتر میں اُن کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا اور میں نے مولانا کو قریب سے دیکھا۔ مولانا مسعودی، جب رعناواری ہری سنگھ ہائی سکول میں مدرس تھے تو اُن کو جدوجہد آزادی نے اس قدر متاثر کیا کہ آپ نے ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی اور سیاست میں آئے۔ قدرت نے آپ کو اس قدر قابلیت کا مالک بنایا تھا کہ آپ بہترین مقرر ہونے کے علاوہ ہر مسئلے پر جو کچھ بھی لکھتے تھے وہ عالمانہ رائے مانی جاتی تھی۔ سیاست میں آپ کو کافی تجربہ تھا اور مذہبی تعلیمات پر کافی عبور حاصل تھا۔ کارکنوں کے ساتھ وہ مسلم کانفرنس کا زمانہ ہو یا نیشنل کانفرنس کا آپ کا گہرا تعلق رہا اور کارکنوں کو بھی آپ کے ساتھ کافی گہرا تعلق رہا ہے۔ آپ پہلے درجے کے قوم پرست تھے۔ جب مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں ۱۹۳۹ء کے خصوصی اجلاس میں بدلنے کی تجویز مرحوم چوہدری غلام عباس خان صاحب نے پیش کی تو مولانا مسعودی نے اُن کی تائید میں جو عالمانہ تقریر کی اُس سے تمام ڈیلی گیٹ حضرات متاثر ہوئے اور تجویز کو قبول کیا۔ مولانا مسعودی شیخ صاحب کے دست راست تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے چوٹی کے لیڈر آپ کی کافی عزت کرتے تھے۔ آپ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس میں جنرل سیکریٹری کے عہدوں پر فائز رہے۔ ملک کی مختلف سیاسی جماعتیں کبھی کبھی آپ سے مشورہ کرتی تھیں۔ مولانا جب تحریک میں آئے تو مسلم کانفرنس کا جو اخبار روزنامہ ''صداقت'' اجرا ہوا۔ اُس کے آپ مدیر اعلیٰ تھے اور آپ کے برادر غلام مصطفٰے مسعودی بھی اُس کے مدیر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہوئی، قبائلی کشمیر میں داخل ہوئے تو اُس وقت کرناہ کے علاقہ کیرن میں جب وہ

داخل ہوئے تو یہاں مولانا کے گھر پر چھاپہ ڈال کر اُن کے برادر مولانا مصطفیٰ مسعودی، حبیب الرحمان مسعودی اُن کے داماد محمد یوسف وغیرہ کو گرفتار کر کے پاکستان کے جیل میں بند رکھا۔ آخر ہندوستان اور پاکستان کے قیدیوں کا تبادلہ ہوا۔ اُن میں مولانا کے ان عزیزوں کو تبادلہ میں بھارت سرکار کے حوالے کیا اور مرکزی سرکار نے ان کو سٹیٹ سرکار کے سپرد کیا۔ جب دہلی سے ان کو سرینگر بذریعہ ہوائی جہاز جموں اور جموں سے سرینگر لایا جارہا تھا تو بانہال پر اس جہاز کو حادثہ پیش آیا اور یہ سب ہلاک ہوگئے اور اُن کی نعشیں سرینگر لاکر خانقاہ معلیٰ کے احاطے میں سپرد خاک کی گئیں۔ آپ کے چھوٹے برادر مولانا نذیر احمد صاحب جو کشمیر کے چیف کنزرویٹر بھی تھے کو ۱۹۳۸ء میں گرفتار کر کے سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ مولانا کے رشتہ داروں کو کافی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب کشمیر میں ایمرجنسی حکومت قائم ہوئی اور پھر شیر کشمیر وزیر اعظم بنائے گئے تو مولانا کو علاقہ کرناہ، کیرن، ٹیٹوال کے لئے ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا لیکن دورہ کے دوران قبائیلوں نے مولانا پر گولی چلائی اور اُن کے بائیں کندھے پر گولی لگی۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۳ء کے بعد مولانا اگرچہ محاذِ رائے شماری سے تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن صادق صاحب کے دورِ حکومت میں جامع مسجد کے باہر مولانا پر لاٹھی چارج کرا کے اُن کے دانت توڑ دیئے گئے۔ غرض مولانا نے جدوجہد آزادی میں جو قربانیاں دیں ان کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ قلمی خدمات سے جو جان تحریک کو بخشی وہ ناقابل فراموش ہے۔ مولانا نے جیلوں میں سیدھی سادھی زندگی گزاری اور ہر وقت مشقت کی اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ صف میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا نے جیل میں ۱۲/دن بھوک ہڑتال کی لیکن اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی قیدیوں کو کچھ رعایتیں دی گئیں۔ کشمیر چھوڑ دو تحریک میں جب سرینگر جیل میں قیدیوں پر سختی روا رکھنے کے خلاف جیل انتظامیہ کے خلاف بھوک ہڑتال ہوئی تو مولانا مسعودی نے مرن برت رکھا لیکن اُس وقت اُن کو

مرتے مرتے زندگی ملی۔ غرض مولانا مسعودی ایک ایسے لیڈر تھے جنھوں نے اپنی زندگی کی ایک ایسے ڈھانچے میں گزاری جو ایک نمونہ تھی۔ جماعتوں کے آئین بنانا، جماعتوں کو مضبوطی سے چلانا، ہدایات وغیرہ مرتب کرنے میں مولانا کا ہاتھ ہوتا تھا۔ جب سرینگر سے شیر کشمیر اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اخبار ''ہمدرد'' مشترکہ طور اجرا کیا تو مولانا کافی مدت تک اُس کا اداریہ لکھتے رہے۔

مجھے اخبار نویسی کے میدان میں لانے اور اخبار چلانے کی تربیت دینے والے مسعودی صاحب تھے۔ جب کشمیر میں ۱۹۳۱ء میں تحریک شروع ہوئی تو یہاں کوئی اخبار نہ تھا تو مولانا مسعودی یہاں کے حالات اور واقعات دیکھ کر ریاست کے باہر خاص کر لاہور کے مسلم اخبارات کو ''رجلن لیسا'' کے نام سے بھیج دیتے تھے اور وہ بھی دستی مرحوم حاجی اسحاق صاحب کے ذریعے۔ مجھے ۱۹۵۳ء کے بعد مولانا کے ساتھ سیاسی طور اختلاف رہا لیکن مولانا نے جب بھی سنا، میں بیمار ہوں تو ہسپتال یا گھر خبر پُرسی کے لئے آتے رہے۔ مولانا نے کبھی اپنے اور مخالف میں فرق نہ سمجھا۔

اگرچہ شیخ صاحب کو کبھی کبھی ان کی رائے سے اختلاف رہا لیکن اُنہوں نے ہمیشہ مولانا مسعودی کی عزت کی۔ غرض مولانا مسعودی ایک ایسی شخصیت تھی جنھوں نے تحریک آزادی میں وہ رول ادا کیا جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ جیل کی سختیوں سے مولانا کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ اُن کو دمہ وغیرہ کی شدید تکلیف رہی۔ یوں کہیے وہ زندگی اور موت سے لڑتے رہے۔ آخر وقت آیا جدوجہد آزادی کی یہ نشانی بھی ہم سے جدا ہوئی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مولانا مسعودی کی موت اُن کے رشتہ داروں، بھائی بندوں کے لئے صدمہ ہونے کے علاوہ یہ صدمہ اُن تمام رفیقوں کے لئے بھی ہے جنھوں نے مولانا کے دوش بدوش جنگِ آزادی میں کام کیا۔

☆☆☆ (ماخوذ: ہفت روزہ نوائے قوم)

☆......محمد یوسف ٹینگ

مولانا محمد سعید مسعودی......ایک غیر رسمی گفتگو

مولوی صاحب بہت کم انٹرویو وغیرہ دینے کے لئے تیار ہوتے تھے۔ یہ ۵راگست ۱۹۸۳ء کا واقعہ ہے۔ یہ گفتگو اُن کے اُس وقت کے ڈیرے بی ہامہ گاندربل میں اُس مکان میں ہوئی جو روایتاً اُن کے چھوٹے بھائی نذیر احمد مسعودی صاحب کا تھا۔ میرے ساتھ اکیڈمی کے دو رفیق چمن لال چمن اور محمد احمد اندرابی تھے۔ یہ گفتگو ساڑھے پانچ بجے دن سے رات کے ساڑھے نو بجے یعنی چار گھنٹے تک جاری رہی۔ راقم نے اُس کے کچھ نوٹ لئے۔ مگر مولوی صاحب نے شرط رکھی کہ یہ اُن کی زندگانی میں شائع نہ ہوں۔ مولوی صاحب اس کے ساڑھے سات سال تک زندہ رہے لیکن اُس کے بعد چوبیس سال تک بھی مجھے اس کے شائع کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ اب فضل ربی سے ایسا ممکن ہو سکا ہے اور میں اس کو قارئین کی بھینٹ کر رہا ہوں۔

دیر سے دور سے آیا ہوں، مگر آیا ہوں

مولوی صاحب کا حافظہ بلا کا تھا۔ اُنہیں سینکڑوں اشعار یاد تھے اور وہ ہر واقعہ کا ادراک رکھتے تھے لیکن اُن کی زبان یا قلم سے کوئی درشت جملہ شاید ہی نکلا ہو۔ شیخ محمد عبداللہ کب پیدا ہوئے۔ اُس کا حتمی تعین مشکل ہے۔ اُن کے سکول کے رجسٹر اور ریکارڈ موجود نہیں ہیں۔ اُن کے بڑے بھائی شیخ غلام محی الدین اپنی تاریخ پیدائش ۱۳۱۷ھ بتاتے ہیں۔ شیخ عبداللہ اُن سے دو یا زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال چھوٹے ہیں۔ یعنی اُن کی پیدائش ۱۳۲۰ھ کے آس پاس ہوئی۔ خود شیخ محی الدین صاحب کا حافظہ اچھا ہے

اور اُن کا اندازِ بیان ذمہ دارانہ۔ خود میری عمر کے متعلق ہمارے گھر میں اندراج ہے۔ شوال ۱۳۲۰ھ یہ اس لئے صحیح ہے کہ ہمارے خاندان میں کچھ پڑھنے لکھنے کا رواج تھا اور بچوں کی ولادت کی تاریخیں قرآنِ شریف کے ساتھ ملحق ایزادی صفحات پر لکھتے تھے۔ آپ کا سوال ہے کہ شیخ صاحب کو کیوں تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا بانی مانیں۔ دیکھئے، ۱۹۳۱ء سے بھی چند سال پہلے کشمیر میں ایک عوامی ہلچل سی پیدا ہوگئی تھی، خاص طور پڑھے لکھے طبقے میں بے چینی کا احساس جاگ رہا تھا۔ شیخ صاحب جیسے لوگ اچانک اور Abrupt طریقے پر پیدا نہیں ہوتے اور نہ آسمان سے ٹپک پڑتے ہیں۔ وہ ایک خاص فضا میں پنپتے اور پیش قدمی کرتے ہیں۔ کشمیر میں میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ اور ملارٹہ کے سید میرک شاہ اندرابی نے پہلے ہی کچھ گونج پیدا کی تھی۔ جب مولوی یوسف شاہ دیوبند سے واپس آئے تو انہوں نے ۱۹۲۵ء میں یہاں خلافت کمیٹی قائم کی کہ ان دنوں خلافت عثمانیہ (ترکی) کے خاتمے پر مسلمان بہت تلملا رہے تھے۔ خلافت کمیٹی پر دیوبندیوں کا اثر تھا اور یہ دونوں حضرات اس کے حلقے میں آگئے۔ خلافت کمیٹی میں سب سے بزرگ ہستی شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی تھی۔ مولانا انور شاہ لولابی بھی وہیں تھے۔ مولانا محمود الحسن کو انگریزوں نے جزیرہ مالٹا پہنچا کر وہاں اسیر کرلیا۔ میرک شاہ صاحب وہاں اُستاد تھے۔ وہ یہاں آئے۔ کمیٹی تو بنائی مگر عوامی رابطے کے گُر آتے نہیں تھے۔ بہر حال کچھ اُتھل پتھل ہوئی تو ڈوگرہ راج نے سعد الدین شال صاحب کو جلاوطن کردیا اور نور شاہ نقش بندی کو تحصیلداری سے موقوف کردیا۔ اُدھر ریشم خانہ کی شورش ہوئی۔ دراصل یہ مزدوروں کی تخفیف کے معاملے پر شروع ہوا۔ سرکار نے ولایت سے تازہ مشینیں منگوائیں تھیں جس سے کام زیادہ ہوتا تھا اور مزدوروں کی کم ضرورت رہ گئی تھی۔ ریشم خانے کے مزدوروں نے جلوس نکالا۔ حکومت حرکت میں آگئی۔ بہت سے لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا اور بہت سے کارکنوں کو نوکری سے نکالا گیا۔

اس کے علاوہ لوگوں میں دہشت پیدا کرنے کے لئے رسالہ (گھوڑسوار) فوج کا مارچ کرایا گیا۔ اُدھر کشمیری پنڈت بھی کچھ بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ اُن کے کچھ لوگ لاہور سے اخبارات نکال کر اپنے مفادات کے لئے ڈوگرہ حکومت کی نکتہ چینی کر رہے تھے۔ فضا میں چنگاریاں بھڑک رہی تھیں مگر شعلہ بننے کی صورت نہیں آئی تھی۔ حکومت کے سی آئی ڈی اُنہیں عام لوگوں کے اضطراب کی اطلاعات دے رہے تھے۔ نتیجہ ہوا کہ رئیس کشمیر سعد الدین شال، میر واعظ مولانا احمد اللہ ہمدانی اور سید نور شاہ نقش بندی پر دربار شاہی میں حاضری پر پابندی لگائی گئی۔ یہ گویا اُن کے لئے سزا تھی اور عوام کے لئے تنبیہ۔ مگر یہ سب اُوپر اُوپر ہی ہو رہا تھا۔ اس کی عوامی سطح پر کوئی گونج نہیں تھی۔ یہ صورت حال تھی جب شیخ عبداللہ علی گڑھ سے آئے۔ وہ اپنے ہم خیال دوستوں عبدالعزیز فاضلی، منشی غلام محمد وکیل، محمد رجب وغیرہ کے ساتھ ملتے جلتے تھے اور تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ خواجہ غلام احمد عشائی ایک مردِ زیرک تھے اُن کا دیوان خانہ اس ڈفلی کی آماجگاہ بننے لگا۔ عشائی صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز رہ چکے تھے۔ مگر اُن کو بوجوہ موقوف کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی بحالی چاہتے تھے اس لئے کچھ احتیاط بھی کر رہے تھے مگر ان نوجوانوں کو حوصلہ بھی دیتے جاتے تھے۔ ان دوستوں نے یا تو ملازمت کے لئے اپنے مقصد سے کنارہ کشی کی یا مشکلات سے تنگ آ کر ہمت ہار دی۔ اس مرحلے پر شیخ عبداللہ کا استقلال آڑے آیا۔ اسی لئے وہ تحریک کی لیلیٰ کا آنچل تھامے رہا اور قحط الرجال میں بانی کہلانے کا حقدار بھی بنا۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ وہ اُس وقت خانیار میں تھے۔ وہ جموں کے پرنس آف ویلز کالج (آجکل گاندھی کالج) اور ایس پی کالج میں ایک ایک سال گزارنے کے بعد اب رعناواری ہائی سکول میں مدرس تھا۔ میں نے مظفر آباد میں کچھ عرصہ ملازمت کی تھی، وہ کہتے تھے مگر اب سکول میں میری ملازمت مستقل تھی۔ سرینگر میں میری کم جان پہچان تھی اور کوئی سوسائٹی برادری ندارد

تھی۔ البتہ خانیار میں میر مقبول گیلانی صاحب کے یہاں آنا جانا شروع ہوگیا۔ اُن کو اسی نئی ہلچل کی چاٹ لگ گئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک بڑے جاگیردار اور سجادہ نشین تھے۔ اُن کے یہاں کچھ اچھے لوگ آتے تھے اور وہاں بات چیت میں سیاست کے چرچے بھی شامل رہتے تھے۔ یہی زمانہ تھا جب ۱۹۳۱ء کے اوائل میں مہاراجے کے بے چراغ گھر میں کرن سنگھ نام کا جانشین پیدا ہوگیا۔ مہاراجہ اپنے گھرانے کے ساتھ خوشی سے پھولے نہ سمایا اور اُس نے بھی اس جشن کو زیادہ بھڑکیلا بنانے میں اپنی خیر دیکھی۔ مندروں، مسجدوں میں دُعائیں مانگی گئیں۔ مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ کرن سنگھ فرانس کے شہر کینس میں پیدا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ہری سنگھ اپنے ولی عہد وغیرہ کو لے کر بمبئ واپس آگیا۔ پنڈت بل کاک دَر جو در خاندان کے بڑے اور ایک زبردست جاگیردار اور سرکاری منصب دار تھے، نے اُنہیں خود بھی مبارکبادی کے تار بھیجے بلکہ اپنے اقرباء سے بھی بے شمار تار روانہ کروائے۔ اُدھر وقت کے اخبارات ''ٹریبون'' لاہور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں بھی رُوسا، جاگیرداروں، ذیلداروں وغیرہ کی طرف سے پیغامات کے نقارے بجنے لگے۔ یہ صورت حال مسلمان روسا اور جاگیرداروں کے لئے ناگوار بنتی جارہی تھی اور وہ اپنا ڈنکا بجانے کی دُھن میں لگے ہوئے تھے۔ اس سوچ میں عشائی صاحب، میر مقبول صاحب اور میں (مولوی صاحب) بھی شامل تھے۔ چنانچہ میر مقبول صاحب کے گھر میں مسلمان جاگیرداروں، رئیسوں، ذیلداروں وغیرہ کا ایک اجلاس بُلایا گیا۔ سلام شاہ نقشبندی کو آگے آنے کو کہا گیا۔ لیکن اُس نے بات ٹال کر نور شاہ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ نور شاہ کہنے لگا کہ میں سرکاری ملازم ہوں، کیا کروں۔ نور شاہ، سلام شاہ اور بلہ کاک دَریوں تو وزیر وزارت کہلاتے تھے لیکن تھے دراصل تحصیلدار ہی۔ کوئی کشمیری تحصیلداری سے بڑھ کر نہیں تھا۔ وفادارانِ خاص ہونے کے باوجود اُن کی حدود مقرر تھیں۔ البتہ دربار مہاراجی میں اُن کی کرسیاں بہ طور

جاگیردار مقرر تھیں۔ میر مقبول رئیس، مذہبی مرتبہ دار اور جاگیردار تھے لیکن آگے آنے میں گریز پا۔

ان حالات میں عشائی صاحب کے مشورے پر نوجوانوں کی اس ٹولی نے ایک ریڈنگ روم کی بنیاد رکھی۔ نام تو ریڈنگ روم کا تھا لیکن وہاں اسی سیاست آزمائی کے تانے بانے بُنے جاتے تھے۔ شیخ صاحب اب ماسٹر بن گئے تھے اور ماسٹر عبداللہ اس گروہ میں نمایاں ہونے لگے۔ کبھی کبھی کچھ میٹنگیں خانیار، خانقاہِ معلیٰ وغیرہ میں طلب کی جاتی تھیں۔ ان میں نوجوان بھی شامل ہونے لگے۔ ایک ایسی ہی میٹنگ میں قرارداد پیش ہوتی ہے کہ مہاراجہ صاحب کو ولی عہد کے پیدا ہونے پر مبارکباد دی جائے اور التماس کی جائے کہ جب وہ سرینگر تشریف لائیں تو نشاط باغ میں ہماری مبارکباد کی پارٹی قبول کریں۔ یہ میٹنگ خانیار میں میر مقبول صاحب کے دیوان خانے میں ہو رہی تھی جب کچھ لوگ بول چکے تو عبداللہ بھی بولنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ مہاراجہ صاحب کے اعزاز میں دعوت کی جائے۔ مگر مناسب ہوگا کہ وہاں پر کشمیر کے پسماندہ لوگوں خاص طور مسلمانوں کی پریشانیوں کا ذکر اُن کے مسایل بھی پیش کئے جائے۔ یہ اس لمبے تڑنگے اگرچہ ضعیف ونحیف آدمی کی پہلی عوامی تقریر تھی۔ جاگیردار درباریوں کو یہ بات پسند نہ آئی کہ وہ مہاراجہ کو کسی عوامی مقصد کے لئے بلکہ زیادہ تر اس لئے بلانا چاہتے تھے کہ اپنے پنڈت اجارہ داروں سے پیچھے نہ رہ جائیں اور اپنی وفاداری کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کر سکیں۔ مسایل وغیرہ کے ذکر سے وہ مہاراجہ کے منہ کا مزہ رکر کرا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شیخ صاحب نے کشمیری زبان میں خوب تقریر کی لیکن ان کی بات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ مہاراجہ نے کسی کی دعوت قبول نہیں کی اور اس سے اوپری سطح پر کچھ ناراضگی پھیل گئی۔ چنانچہ وقت کے گورنر نے کچھ نوجوانوں کو بات چیت کے لئے بلایا۔ ان میں عبدالعزیز فاضلی اور عبداللہ بھی شامل

تھے۔ وہاں ان کی گورنر سے کچھ تیز کلامی بھی ہوئی اور شیخ صاحب نے خاص طور بہت کڑوا کسیلا بولا۔ یہ بات پھیلنے لگی۔ اُدھر بہت سے معاملات میں جموں اور سرینگر میں ناراضگی بڑھ رہی تھی۔ ان میں جموں عیدگاہ میں ایک کانسٹیبل کے ہاتھوں توہینِ قرآن، خطبے کی ممانعت وغیرہ باتیں بھی شامل تھیں۔ سرینگر میں ان باتوں کی مذمت میر واعظ کشمیری مولوی یوسف شاہ صاحب بھی کر رہے تھے۔ نوجوانوں نے بھی مذمت میں کاروائیاں کیں، جن میں عبداللہ بھی تھے۔ جموں سے کچھ مسلمان عمایدین نمائندے بن کر آئے۔ کشمیر میں اُن سے بات چیت کرنے کے لئے جو کمیٹی بنی اُس کے صدر مولوی یوسف شاہ تجویز ہوئے اور سیکریٹری شیخ عبداللہ۔ یہاں بھی مسلم نمائندے نامزد کئے جانے تھے۔ اُدھر لاہور کے اخبارات میں کشمیر میں بے چینی پر مراسلے اور مضامین چھپ رہے تھے جن میں سے کچھ میرے قلم سے بھی نکلتے تھے۔ اسی دوران ۲۳ رجون میں خانقاہِ معلّٰی میں ایک پبلک جلسہ کرنے کا پروگرام بنا لیکن وہاں مولوی یوسف شاہ کو شریک بنانا کشمیری محاورے کے مطابق ''بونہ مُہل تارُن'' کے برابر تھا۔ بہت مشکل کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی میر واعظ کلان یعنی جامع مسجد کے میر واعظان اور یہ واعظِ خُرد یعنی خانقاہِ معلّٰی کے ہمدانی صاحبان کے درمیان تقسیمِ کار ہوا تھا۔ اگرچہ دونوں خاندان بہت قربت رکھتے تھے لیکن بعد میں وہ ایک دوسرے کے بہت بڑے حریف بن گئے۔ صرف پلیٹ فارموں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ عقاید، روایات وغیرہ میں بھی الگ اور کبھی کبھی مُتضاد۔ بہر حال، وہ تشریف لائے، پہلے خانقاہ کے اندر حاضری دی۔ پھر جلسے میں نمائندگان کا انتخاب ہوا، جن میں خود مولوی یوسف شاہ، مولوی ہمدانی، سعدالدین شال، سید حسن شاہ جلالی، شہاب الدین، خواجہ غلام احمد عشائی اور خود شیخ صاحب شامل تھے۔ سٹیج کے آس پاس ہی ہمدانیہ مڈل سکول کی عمارت تھی۔ وہاں ہمارے لئے چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں اس کے ایک کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک

آدمی ہاتھ ہلاتا ہوا زور سے بول رہا ہے۔ اُس کے سر پر تُرکی ٹوپی[1] تھی۔ یہ آدمی کچھ سیاہ فام لگ رہا تھا لیکن اتنے جوش سے سر اور ہاتھ لہراتا تھا کہ اُس کی ٹوپی کا پھندنا (کشمیری میں پھیوت) بھی ناچ رہا تھا۔ وہ آٹھ دس منٹ بولا اُردو میں۔ اُس وقت عام لوگ یہ زبان کیا سمجھتے۔ لیکن اُس نے کہا آپ کو باتوں سے انصاف نہیں ملے گا۔ اُٹھو حرکت کرو اور اپنی بات منواؤ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس شخص کا نام عبدالقدیر ہے اور یہ صوبہ جاتِ متحدہ (آج کا یو پی) کا رہنے والا ہے۔ کشمیر میں کسی انگریز کے ساتھ ہاؤس بوٹ میں رہ کر اُس کی ملازمت میں ہے۔ بہر حال' اُس کو کچھ دن کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔ جب اُس کی گرفتاری کی خبر پھیلی تو عوام میں اور زیادہ اضطراب پیدا ہو گیا اور اُس پر مقدمہ چلانے کی نوبت آ گئی۔ نمائندہ گان نے مولوی عبداللہ وکیل صاحب کو وکالت کے لئے چُنا۔ عبدالقدیر کو ایک دو بار عدالت میں پیش کیا گیا تو لوگ بھی وہاں آنے لگے اور ہلچل سی مچ گئی۔ پولیس بھی چوکنی ہو گئی۔ ہائی کورٹ سے حکم لایا گیا کہ اب اس کی پیشی سنٹرل جیل میں ہی ہو گی اور وہ بھی In Camera۔ ہم نے ان دنوں پہلی بار یہ ترکیب سُنی۔ لوگوں میں افواہ پھیل گئی کہ اب عبدالقدیر کو پھانسی ہونی ہی ہونی ہے۔ حکومت کی یہ غلطی تحریک کی آگ سلگانے میں ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ اُدھر کچھ مسلم نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے بعد بے کاری کا دُکھ جھیل رہے تھے۔ اُنہی دنوں گاؤ کدل کی ایک مسجد میں اجتماع ہوا۔ اس خاکسار نے تلاوت قرآن کی اور شیخ صاحب نے تقریر۔ شیخ صاحب نے کہا کہ عبدالقدیر کے خلاف جیل میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ مگر عام لوگوں کو

---

[1] تُرکی ٹوپی دراصل مراکش کے شہر فیض میں بنتی تھی۔ وہ سُرخ رنگ کی ہوتی اور اُس کے اوپر ایک پھندنا لہراتا تھا۔ چونکہ تُرکوں نے بھی' جو ان دنوں با اختیار تھے پہنی۔ لہٰذا یہ عالم اسلام میں مقبول بن گئی۔ خلافت تحریک میں مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے برادر مولانا شوکت علی بھی پہنتے تھے۔ لہٰذا کشمیر کے پُر جوش مسلمانوں میں بھی اپنائی گئی۔ ۱۹۳۱ء کے بعد کچھ دیر شیخ صاحب نے بھی پہنی۔

وہاں نہیں جانا چاہیئے ۔ ہم عبدالقدیر کا قانونی بچاؤ کریں گے ۔ لوگوں کو وہاں نہیں جانا چاہیئے ۔ اُن کی اس تقریر کو لوگوں نے دوسرے معنوں میں لے لیا ۔ یعنی نہ جانے کا مطلب ہے ۔ ضرور جاؤ ۔ اور جو کچھ بعد میں پیش آیا وہ تواریخ کا حصہ ہے ۔ میں نے مولانا سے پوچھا کہ آخر شیخ صاحب کیوں سب سے آگے نکل گئے ؟ اُنہوں نے کہا کہ عبداللہ کی جرأت کہیے یا جسارت تھی جہاں باقی نمائندگان سوچتے رہے وہاں شیخ صاحب آگے جا کر چھلانگ لگاتے تھے ۔ یہ بات عوام کو بھاتی تھی ۔ اُن میں اور بھی کچھ باتیں تھیں ۔ اُن کا لمبا قد، وہ عوامی مجمع میں سب سے اونچے نظر آتے تھے ۔ قرآن مجید تو سب کے پاس تھا لیکن ایک دل نشین لحن ان کو ہی عطا ہوئی تھی ۔ جب وہ اپنی میٹھی آواز میں تلاوت کرتے تو عوام کے آنسو جاری ہوتے تھے ۔ میں بعد میں آیاتِ پاک کی شرح کرتا ۔ کچھ صاحبان تو صرف اُن کی تلاوت سُننے کے لئے آتے اور نماز پڑھے بغیر لوٹتے ۔ اس طرح عبداللہ ایک ہجوم ساز بن گئے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں جرأت کے ساتھ خلوص اور بے نفسی کی رمق بھی تھی اور یہ لوگوں کو بہت رجھاتی تھی ۔

میں نے سوال کیا کہ مولوی صاحب آپ کی شیخ صاحب سے کب جان پہچان ہوئی ۔ اُنہوں نے کہا کہ جب ہم دونوں ٹیچر تھے تو کہیں نہ کہیں آمنا سامنا اور علیک سلیک ہوتی رہتی تھی ۔ اُن دنوں وہ نواب بازار میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو نالے کی طرف تھا ۔ وہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ دِق (T.B.) میں مبتلا ہیں ۔ وہ اکثر لیٹے رہتے تھے ۔ جب کبھی میں جاتا تو کچھ معاملات لکھنے کے بارے میں کہتے تھے ۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کی گرفتاریوں میں شیخ صاحب، بخشی صاحب، شیخ محمد اکبر بارہمولہ اور غلام قادر (شیر گاندربل) ایک ہی سنگین کوٹھڑی میں رکھے گئے ۔ مجھے بھی سنگین قید میں رکھا گیا ۔ ۱۱۳/ قیدیوں میں سے ہم کو ہی قیدِ سنگین میں جگہ ملی ۔ بہر حال، میں نے کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ بھوک ہڑتال کی تو ہمیں سنگین سے

نکالا گیا۔ ہماری کوٹھڑی کے سامنے پانی کا ایک نلکہ تھا۔ ایک دن شیخ صاحب اور میں وہیں پر ملے۔ باقی دوستوں کو چھ چھ مہینے کی سزا ہوئی اور مجھے دوسال کی۔ پھر رہائی ہوئی تو تنظیم بنانے کی سوجھی۔ میں نے مسلم کانفرنس کا نام تجویز کیا۔ شیخ صاحب نے اسے قبول کیا۔ اُدھر کچھ عرصے کے بعد گلاسینی کمیشن بنا اور اُس کی رپورٹ شائع ہوگئی۔ اس دوران کرنل کامون وزیراعظم بن کے آگئے۔ قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ تیز ہوگیا۔ میں نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ اُن دنوں تحریک پر قادیانی اثر ونفوذ تھا جبکہ آپ قادیانیوں کے کٹر مخالف احراریوں کے ساتھ منسلک تصور کیے جاتے تھے۔ شیخ صاحب کا کیا رویہ تھا؟

مولانا نے کہا کہ یہ درست ہے کہ میں مجلسِ احرار سے متاثر تھا۔ لیکن قادیانی مذہب کا کوئی زیادہ نفوذ نہیں تھا۔ اُن کے خلیفہ بشیر الدین محمود کے علاوہ سر ظفر اللہ خان، سر فضل حسین وغیرہ کشمیریوں کی دامے، درہمے، سخنے در پردہ اعانت کرتے رہتے تھے۔ اُن میں قدر مشترک یہ تھی کہ وہ انگریزی حکومت کے خیر خواہ تھے۔ لیکن احرار بڑے مستانہ مجاہد تھے۔ آپ کو یہ بتاؤں کہ تحریک کے ابتدائی کارکنوں میں محمد مقبول بیہقی اور اندرابی صاحبان کے علاوہ غلام محمد بخشی بھی احراریوں کے حلقۂ اثر میں تھے۔ یہ ایک اچھی خاصی ٹولی تھی۔ لیکن احراری انتہا پسند اور گرم مزاج تھے۔ اس لئے ان کی قربانیوں کا فائدہ لوگ اُٹھانے سے محروم رہے۔ سر فضل حسین ہمارے لیڈروں کو در پردہ مشورے دیتے رہے تھے۔ لاہور کی کشمیر کمیٹی کے مسودے ان کی ہی فکر کا نتیجہ تھے۔

میں نے پھر مولانا سے سوال کیا کہ شیخ صاحب اور قادیانیوں کے بارے میں صراحت کریں۔ اُنہوں نے کہا کہ میں اُن کے نجی معاملات سے زیادہ باخبر نہ تھا۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ جب شیخ صاحب لاہور کے اسلامیہ سکول میں زیرِ تعلیم تھے تو وہاں احمدیوں کا خاصا چلن تھا۔ وہ مسجدوں میں درسِ قرآن دیتے تھے۔ اُن دنوں وہاں احمد

علی اور محمد علی دو دانشوروں کی دھوم تھی۔ احمد علی شیرانوالہ دروازے میں اور محمد علی احمدیہ بلڈنگ میں۔ مسجدِ وزیر خان میں مولانا دیدار علی بریلوی، بھاٹی دروازے میں مولانا غلام مُرشد دیوبندی، چستیاں والے میں ایک اہلِ حدیث مولوی۔ ان درسوں میں کثیر تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوتے۔ محمد علی جدید تعلیم سے آراستہ اور باخبر عالم دین تھے۔ شیخ صاحب وہاں جاتے رہتے۔ مگر محمد علی دین کے معاملات سے باہر بات نہ کرتے۔ مولوی عبداللہ وکیل کے وہاں جانے کا معلوم ہے۔ مگر شیخ صاحب کے درس میں شریک ہونے کا معاملہ مُبہم ہے۔ مولوی عبداللہ صاحب کے مسلک پر بھی سوالیہ تھا؟ لاہوریوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا مگر اُن کا ہم خیال ہونے سے انکار کرتے۔ مولوی صاحب سے ایک دن میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا کہ اب تک مسلمانوں کے بہتر فرقے مانے جاتے تھے۔ اب آپ کی بدولت لگتا ہے کہ تہتر ہو جائیں گے۔ وہاں بیٹھے لوگ ہنسنے لگے مگر مولوی صاحب زِچ ہو گئے اور کہا کہ تم چپ رہو بھائی۔ مولوی صاحب بہت ذہین آدمی تھے۔ ایسے لوگ خال ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اُن دنوں قادیانی احراری اکٹھے تھے۔ میرا سب سے قریبی ساتھی غلام نبی گلکار قادیانی تھا۔ اُس کی جرأت اور قومی دردمندی بہت متاثر کُن تھی۔ جب ۱۹۶۴ء میں، میں شیخ صاحب کے ساتھ راولپنڈی گیا تو وہاں تین بار گلکار صاحب سے ملاقات ہوئی اور ہر بار وہ کشمیریوں کی حالتِ زار پر پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔

پھر مولوی یوسف شاہ صاحب اور شیخ صاحب کے جدا ہونے کا ذکر چلا۔ مولوی صاحب نے جب اپنی بلاشرکت غیرے قیادت میں رخنہ پڑتے دیکھا تو اپنے مصاحبوں مشیروں کے مشورے پر الگ ہونے میں ہی بہتری سمجھی۔ لیکن اُنہیں اس رسی کو توڑنے کا جواز بھی ڈھونڈنا تھا تاکہ عوام اُن کو حق بجانب سمجھیں۔ اُنہوں نے شیخ صاحب کی قادیان نوازی کا قصہ چھیڑ دیا اور اس میں خاص طور گاؤ کدل کی بازار مسجد

کے اپنے حامی مولوی غلام نبی مبارکی کی اعانت حاصل کی۔ مبارکی صاحب وعظ اچھا کرتے تھے اور ان کا حلقوم اتنا رسیلا تھا کہ کشمیریوں کی خاص مہارت کے طور کچھ لوگ اُن کو 'نبہ قمیور' یعنی غلام نبی المعروف قمری (جو بہت میٹھی آواز کا پرندہ ہے) کہہ کر پُکارتے تھے۔ وہ اپنا راگ چھیڑنے لگے تو ہم نے اُس کا جواب ڈھونڈنے کی تدبیر سوچی۔ ہم مولانا انور شاہ صاحب سے خط لے آئے۔ اُن کی قادیان مخالفت مسلمہ تھی۔ اس خط کو ہم نے ایک بڑے پوسٹر کی شکل میں شائع کیا۔ مولانا انور شاہ صاحب کی اتنی عزت تھی کہ جب وہ ایک بار سرینگر آئے تو مسجد میں نماز کے لئے گئے وہ دالان میں جوتا نکالنے لگے تو ان کے کتنے ہی عقیدت مند جوتا سنبھالنے کے لئے آگے بڑھے۔ مگر مولوی یوسف صاحب نے اُن کو ڈانٹ دیا کہ میرے سوا کسی کو حق نہیں کہ ان کے جوتے کو ہاتھ لگائے کہ میں اُن کا شاگرد رہ چکا ہوں۔ مولانا انور ہر سال قادیان جا کر احمدیوں کے خلاف بولتے اور کسی کی کیا مجال تھی کہ اُن کو ٹوکے۔ اُن کے خط کی اشاعت نے اس ساری لڑائی کا رُخ موڑ دیا۔

میں نے مولانا سے پوچھا کہ کچھ تاریخ دانوں، خاص طور پنڈت حضرات نے تحریکِ کشمیر کو انگریزوں کی ہمدردی سے ملا دیا ہے؟ مسعودی صاحب بولے کہ انگریزوں کی مہاراجہ سے کچھ ان بن ہوگئی تھی کہ اُن کے مفادات الگ تھے اور گلگت پر اُن کی نگاہیں جمی ہوئیں تھیں۔ اس کے علاوہ ایک خاص حد تک وہ عوامی تحریکوں سے نرمی برتنے کے روادار تھے۔ اپنی لبرل روایات کے حوالے سے۔ لیکن شیخ صاحب کا مرکز کی حکومت سے کوئی رابطہ نہیں رہا نہ اُنہوں نے اس کی کوئی کوشش کی۔ مہاراجے کو ڈرا دھمکا کر انگریزوں نے گلگت پر ہاتھ پھیلایا۔ یہ اُن کی حکمتِ عملی تھی۔ اگر اُس سے تحریکِ کشمیر کا کوئی بھلا ہوا تو اُس میں کسی کا کیا دخل؟ یہ وقت کی دانائی تھی۔

میں نے مسعودی صاحب کا قافیہ تنگ کرنے کی کوشش کی۔ "آخر احمدی

کیوں تحریکِ کشمیر سے دامن چھڑا گئے"۔ مولانا بولے ۱۹۳۱ء تحریک کے آغاز اور دھما کہ خیزی کا سال تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرنس بن گئی۔ اب کچھ حلقوں کی رال ٹپکنے لگی اور وہ تحریک پر چھا جانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ ایک دو سال تک کشمکش اور Tug of War کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ لاہور میں دو جماعتیں کشمیر کے اندر دو عناصر کی پیٹھ ٹھونک رہی تھیں۔ احمدی خلیفہ سوچنے لگا کہ میں نے خلوص سے اعانت کی تھی۔ قانونی مدد بھیجی۔ کشمیر کے معاملات کا ڈنکا بجایا اور خلوص دل سے امداد کی۔ اب ہم پر سوال اُٹھ رہے ہیں۔ تو ہم کیوں خسارہ برداشت کریں؟ ہمارے لئے زیادہ اچھا ہے کہ ہم اس معاملے سے دست کش ہو جائیں۔ شاید اُن کا خیال تھا کہ وہ ہاتھ کھینچ لیں تو کشمیر کی تحریک ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن یہ اُن کی غلط اندیشی ثابت ہوئی۔ مرزا محمود کشمیر کمیٹی سے نکلے تو علامہ اقبال اس کے صدر بن گئے۔ لیکن علامہ فلسفی اور شاعر تو بڑے تھے مگر عملی سیاست کار نہ تھے۔ نہ اُن کے پاس قادیانیوں کی طرح کارکُن تھے کہ ان کے اشاروں پر کام کریں نہ تنظیمی دروبست کی دوسری لوازمات۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کمیٹی کی ہی روشنیاں گُل ہونے لگیں۔ وہ پس منظر میں چلیں گئی تو مسلم کانفرنس کا بول بالا ہونے لگا۔ شیخ صاحب کہنے لگے کہ ہمیں بیرونی سہاروں کی ٹیک لینے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ اُدھر احراری بھی کشمیر میں کچھ نہ کر کے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ البتہ اُن کی خواہش تھی کہ مسلم کانفرنس کوئی ایسی بات نہ کرے کہ کُل ہند پیمانے پر مجلس احرار کے Posture پر اس سے ضرب پڑ جائے۔ میں نے معاملے کو آگے بڑھاتے ہوئے پرجا سبھا کا ذکر چھیڑ دیا۔ مولوی صاحب بولے۔ ہمیں خوب معلوم تھا کہ اس کی حقیقت ایک چھلاوے سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن بہر حال سیاسی سطح پر اس سے ایک پیش قدمی کا احساس اُبھرتا تھا اور سرگرمیوں کا ایک نیا چکر شروع ہو جاتا تھا اور تحریک کے لئے اس سے بہتر اور کیا حالت ہو سکتی تھی؟

سلسلہ کلام کو زیادہ پرکشش بنانے کے لئے میں نے علامہ اقبال کا ہاتھ تھام لیا اور اُن سے وضاحت چاہی۔

مولانا بولے...... آپ شیخ صاحب کے جس بیان کا ذکر کرتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اُنہیں نیشنل کانفرنس بنانے کی صلاح دی تھی اُس کے بارے میں، میں تصدیق کرنے سے قاصر ہوں۔ میں ۱۹۳۴ء میں لاہور میں تھا اور علامہ کے یہاں کبھی کبھار حاضری دینے کے لئے جاتا رہتا تھا۔ اُن دنوں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ حالانکہ وہ کشمیر کا ذکر خیر کرنے میں ہمیشہ محو رہتے تھے۔ شاید یہ اُس کے بعد کی بات ہو گی کہ نیشنل کانفرنس کے قیام کا شگوفہ ۱۹۳۸ء میں پھوٹا۔ مجھے اس بارے میں کوئی براہِ راست واقفیت نہیں ہے۔ حالانکہ میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں حضرت علامہ سے ملاقات کا شرف پاتا رہا۔

میں نے مولوی صاحب کا زرہ بکتر اُترتا دیکھا تو اپنا زیادہ سخت وار کرنے کی ٹھان لی۔ مولوی صاحب ۱۹۳۱ء سے ہی لاہور بلکہ ہندوستان کے بارے میں مسلم نمائندگان، لیڈر اور خاص طور اُردو پریس آپ کے حق میں شمشیر بکف رہا۔ حالانکہ کانگریس اور ہندو آپ کی تحریک کے خلاف تھے۔ وہ کھلم کھلا تحریک کو بدنام کر کے مہاراجے کی جانبداری کر رہے تھے۔

مولوی صاحب نے کہا کہ یہ عملی زندگی میں آنے والے واقعات و حوادث کا عکس تھا۔ مہاراجہ ہندو تھا اگرچہ تخت نشینی کے وقت اُس نے بڑے طمطراق سے کہا تھا کہ "انصاف اُس کا مذہب ہے"۔ عام ہندو سمجھتا تھا کہ مجھے اپنے ہم مذہب مہاراجے کی ہی حمایت کرنی ہے۔ لیکن دراصل یہ مفادات کو چھپانے کی ایک چال تھی کہ ایک چھوٹی ذات کا ہندو بھی اُسی بدحالی کا شکار تھا جیسا مسلمان۔ ہم نادانستہ طور ایک بڑی آبادی کو اپنے آپ سے دور کر رہے تھے اور اس طرح مہاراجے اور اُس کے اقرباء کا کھیل کھیل

رہے تھے۔ ہم نے ہندو کو بڑی عوامی مجبوری اور بے بسی کا حصہ بنانے کا راستہ اپنایا اور یہ عقل اور انصاف دونوں کا تقاضا تھا۔ ہماری بدلی ہوئی سوچ کا فوری سبب قومی مطالبہ یعنی National Demand بن گیا۔ اس پر ہندوؤں اور سکھوں کے نمائندوں نے بھی دستخط کر لئے۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ اب مہاراجی حلقہ اسے صرف مسلمانوں کی بات جتا کر اپنا پلو نہیں چھڑا سکتا تھا۔ چنانچہ عوامی تحریک کی رفتار اور اُس کا دائرہ بھی تیز اور وسیع تر ہونے لگا۔ اُدھر سوپور میں راجہ محمد اکبر خان کی رہنمائی میں بغاوت کا ساسماں پیدا ہو گیا۔ اُس دوران مدراس کے ایک نوکر شاہ گوپالا سوامی آئینگر کو پرائم منسٹر مقرر کر دیا گیا۔ وہ ایک پڑھے لکھے آدمی تھے اور اُنہوں نے یہاں آ کر فرقہ وارانہ جانبداری سے اُوپر اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ دکھاوا ہی ثابت ہوا۔ پریم ناتھ بزاز صاحب کے اخبار ''ہمدرد'' نے اُن کو ایک وحشی کی شکل میں پیش کیا۔ اُس نے جلسے جلوسوں پر پابندی لگائی۔ لیکن ہم نے اس کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ شیخ صاحب، مجھے اور کیشپ بندھو جی وغیرہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے جو مظاہرے ہوتے تھے ان میں ہندو اور سکھ بھی شامل ہوتے تھے۔ نعرہ تکبیر کے نعرہ لگتے تھے اور سب راضی تھے۔ بخشی غلام محمد گرفتاری سے بچنے کے لئے لاہور چلا گیا۔ ہم میں سے اکثر کو جن میں غیر مسلم بھی تھے، حراست میں لے لیا گیا اور چھ چھ مہینے کی سزائے قید سنائی گئی۔ اس حال میں غیر مسلموں کو مسلم کانفرنس سے دور جانے کو کہنا مناسب بات نہیں تھی۔ یہ تواریخ کی مجبوریاں بھی تھیں اور حالات کا تقاضہ بھی۔

میں نے مولوی صاحب کو گھیرے میں لینے کی ایک اور کوشش کی۔ ''لیکن آپ اور بخشی صاحب نے تو ۱۹۳۸ء میں مسلم کانفرنس کو قائم رکھنے کی رائے تھی۔''

مولوی صاحب نے کسی جھلاہٹ کے بغیر جواب دیا۔ ''دراصل ہم نئی کروٹ کو صحیح جانتے ہوئے بھی جلدی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ہم لوگوں کو اور کارکنوں کو

تبدیلی کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے لیکن جب ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کے خاص کنونشن میں ایسا کرنے کا فیصلہ ہوا تو خود میں نے یہ رسمی قرارداد پیش کی۔ چوہدری غلام عباس نے اس کی تائید کی اور اس کے حق میں ایک مدلل تقریر کی۔

میں نے استفسار کیا ''لیکن جلد ہی ہندو ممبران کے ساتھ ساتھ چوہدری عباس بھی نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے''۔

مولوی صاحب نے جواب دیا۔ یہ تحریک کا ایک پُر پیچ موڑ تھا اور ایک بڑی آزمائش بھی۔ عام لوگوں میں معاملات کے متعلق ایک بے تعلقی یعنی Apathy سی پیدا ہو گئی تھی۔ جموں اور جامع مسجد سرینگر کے رفقاء کا ایک گروپ بن گیا تھا۔ مظفر آبادی اور میر پوری آپس میں جھگڑتے تھے۔ پونچھی اور کشمیریوں کے مابین بھی ایک بے گانگی سی تھی۔ اُن دنوں بانہال ٹنل بہت اونچائی پر تھی اور بے حد دشوار گزار۔ جموں میں سیالکوٹ کے خیالات کا اثر تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ مضبوط ہو رہی تھی اور جموں میں اس کی بازگشت ہو رہی تھی۔ چوہدری عباس صاحب کا آبائی تعلق جالندھر سے تھا اور اُن کو وہاں کی کشش کھینچ رہی تھی۔ البتہ ہم ان اثرات سے دور اپنے خیالات کی رو میں چلے جا رہے تھے۔ جہاں تک بزاز، کلم اور کیشپ بندھو کے دور ہونے کی بات ہے، اُس میں کچھ تو اُن کی ذات برادری کے دباؤ کا کچھ دخل تھا اور کسی حد تک شیخ صاحب کی اُفتادِ طبع کا۔ وہ اپنی دُھن کے پکے تھے۔ لیکن کبھی کبھی یہ ہٹ دھرمی بن جاتی تھی۔ بزاز صاحب اُردو کو اہمیت دینے کی بجائے ہندی کا ساتھ دینے کا بہانہ بنا کر الگ ہو گئے۔ کلم صاحب کو سرینگر کا ڈسٹرکٹ پریذیڈنٹ بنایا گیا تھا لیکن ۱۹۴۰ء میں جواہر لال نہرو کشمیر آئے تو کلم صاحب کو لگا کہ ان کو پوری اہمیت کے ساتھ آگے آنے کو نہیں کہا گیا ہے۔ اُنہوں نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرنے پر اعتراض کیا اور دور ہو گئے۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس۔

میں نے قصے کو آگے بڑھانے کے لئے کہا" ۱۹۴۴ء میں تحریک کیسے اشتراکیت کے گھیرے میں آ گئی؟"

مولوی صاحب کہنے لگے......روس کے کمیونسٹ انقلاب نے ساری دنیا میں خیالات پر اثر ڈالا تھا۔ اس میں برابری اور اقتصادی مساوات کا جو نظریہ پیش کیا گیا تھا اُس کے لئے عوامی تحریکوں میں بڑی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارے یہاں بھی یہ رو دانشوروں کو اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ شیخ صاحب کی اپنی قوم کو بہتر بنانے کے لئے بے قراری ایسی تھی کہ جہاں کوئی اچھی چیز نظر آتی وہ اس کا استفادہ کرنے کے لئے رجحانات وغیرہ کی پرواہ نہ کرتے تھے لیکن اپنے انقلاب کے ترقی پسندانہ رجحانات کو اپناتے ہوئے روس کی کمیونسٹ Cult کو گلے کا طوق بنانے کے حق میں نہ تھے۔ یہ تھی بنیادی بات اور یہی "نیا کشمیر" کے منصوبے کی ترتیب اور ترویج کا باعث بنا۔ اُس میں کشمیر کی مقامی ضروریات اور عوامی اُمنگوں کو نقش بند کیا گیا تھا......اور ہاں ایک ضروری بات۔ نیشنل ڈیمانڈ سے پہلے ریاستی پرجا سبھا کا دوسرا چناؤ ہوا جس میں مسلم کانفرنس نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ پرجا سبھا میں بہت سی سیٹیں مہاراجہ نامزد کرتا تھا لیکن چناؤ والی سیٹوں پر تقریباً ساری مسلمان سیٹیں مسلم کانفرنس نے حاصل کی تھیں۔ قاعدہ بنایا گیا تھا کہ چھ مہینے کی سزا پانے والے لوگ Disqualify کئے جائیں گے۔ اس کے تحت مجھے، مرزا محمد افضل بیگ، صادق صاحب، غلام نبی وکیل المعرف نبر جی، صوفی محمد اکبر کو ہٹا دیا گیا تھا۔ ہماری گرفتاری کے ساتھ ہی نئے چناؤ ہوئے اور ان میں بھی ہمارے ہی لوگ کامیاب ہوئے۔ اس نیم مصالحتی دور میں نیشنل کانفرنس وجود میں آئی۔ اس کے بعد دوسری عالمگیر جنگ ہوئی۔ جب مہاراجہ یورپ کے دورے پر چلا گیا۔ واپسی پر اُس کے استقبال کی ٹھان لی گئی۔ اُس کا سرکاری جلوس مجاہد منزل کے راستے سے بھی گزرا۔ شیخ صاحب خود سڑک پر نکلے اور مہاراجہ کے گلے میں ہار ڈالا۔ سر تیج بہادر

سپرو مہاراجہ کا مشیر تھا۔ وہ اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے شیخ صاحب سے کہا کہ وہ بھی اُن سے آکر ملے۔ شیخ صاحب ملے تو طے ہوا کہ مفاہمت کی راہ ہموار کے لئے صادق صاحب، بیگ صاحب اور نبر جی کو پرجا سبھا کے لئے نامزد کیا جائے۔ ایسا ہو بھی گیا۔ یہی نیا کشمیر کے بنانے کا پہلا پتھر ثابت ہوا۔ اُن دنوں عوامی مطالبات کا جائزہ لینے کے لئے نیشنل کانفرنس نے ایک کمیٹی بنائی۔ اُس میں، میں، صادق صاحب، بیگ صاحب وغیرہ تھے۔ ہم نے اپنی اکائیوں سے مطالبات کی فہرست طلب کی اور کچھ عوامی حلقوں کی طرف سے بھی۔ اس میں سے بعض مطالبات اور اُن پر کمیونسٹ رنگ چڑھا کر کچھ اور مطالبات جوڑ دیئے گئے۔ بعد میں یہ ڈرافٹ ورکنگ کمیٹی میں پیش ہوا۔ وہاں کاٹ چھانٹ کے بعد دستاویز تیار ہوئی۔ یہ ہم نے گویا اپنے کارکنوں کے لئے Text Book جیسی بنائی تاکہ اُنہیں زیادہ باخبر بنانے کے لئے تعلیم دی جائے۔ اُس وقت کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ ہم اقتدار میں آکر اس کو عملی جامہ پہنائیں گے۔

میں نے بحث کا ایک اور دروازہ کھول دیا۔ میں نے مولوی صاحب سے سوال کیا کہ یہی وقت تھا جب شیخ صاحب نے محمد علی جناح صاحب کو کشمیر آنے کی دعوت دی اور یہاں اُس کا پُرجوش استقبال کیا۔ اس کی اصل کہانی کیا ہے؟

مولوی صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ لیکن وہ بیان سے رُکے نہیں۔ شیخ صاحب کے مزاج کا بھی عجیب عالم تھا۔ جب وہ بگڑتے تھے تو ان کو ٹھکانے پر لانا مشکل تھا۔ اُدھر عوام میں اُن کی مقبولیت تھی اور کوئی دوسرا لیڈر ان سے برگشتہ ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اُس وقت گاندھی جی کی ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' بہت اُبھر کر اب دب چکی تھی۔ مسلم لیگ نے اس کا کوئی فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی کہ خود جناح صاحب انگریزوں کے خلاف اور ہندوستان کی آزادی کے حق میں تھے۔ مگر وہ اپنی حکمت عملی کے حساب سے جیل نہیں گئے۔ ہم میاں افتخار الدین، خان عبدالقیوم خان

وغیرہ پنجاب کانگریس کے لیڈروں سے رابطہ بنائے ہوئے تھے کہ ان صاحبان کا کشمیر سے آبائی تعلق تھا اور وہ کشمیریوں کے ہمدرد تھے۔ وہ اب کانگریس سے دور ہو کر مسلم لیگ کے نزدیک آگئے تھے۔ نواب محمود بٹ بھی اسی قبیل کے تھے۔ وہ کشمیر آئے اور شیخ صاحب سے مل کر اُنہیں مشورہ دیتے رہے کہ جناح صاحب سے رابطہ بناؤ۔ اس میں حرج کیا ہے۔ محمود بٹ مجھے اور صادق صاحب کو ساتھ لے کر جناح صاحب سے ملوائیں گے اور ہم شیخ صاحب اور اُن کی ملاقات کی سبیل نکالیں گے۔ ہم لاہور پہنچے تو صادق صاحب پر گردے کی بیماری کا حملہ ہوا اور وہ آگے نہ جاسکے۔ میں اور ممدوٹ دلی گئے۔ سنٹرل اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے والا تھا اور اُس کے بعد جناح صاحب اپنے گھر بمبئی جانے والے تھے۔ لیاقت علی خان کے ڈیرے پر ملاقات ہوئی۔ ممدوٹ نے میرا تعارف نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے کیا۔ جناح صاحب بڑے رُعب دار لیڈر تھے اور اُن کے سامنے کچھ کم تری کا احساس ہوتا تھا۔ اُن کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ میں انگریزی سمجھ لیتا ہوں مگر بات اُردو میں ہی کر سکتا ہوں۔ مفہوم ممدوٹ صاحب آپ کو بتائیں گے۔ جناح صاحب نے کہا کہ میں اُردو ٹھیک سمجھتا ہوں بات تفصیل سے ہوئی۔ جناح صاحب نے شیخ صاحب سے ملنے کے معاملے پر کہا کہ خود وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے سنٹرل اسمبلی کے نئے اجلاس سے پہلے ہی دہلی آنے سے معذور ہیں۔ اس لئے یا تو شیخ صاحب بمبئی آجائیں ورنہ مارچ میں دلی آجائیں (یہ اکتوبر ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے) مارچ میں شیخ صاحب اور بخشی صاحب دلی گئے۔ بخشی صاحب کی کوششوں سے جناح صاحب کے یہاں رسائی ہوگئی۔ شیخ صاحب کو جناح صاحب نے کہا کہ آپ سے رابطہ رکھیں گے۔ لیکن آپ جواہر لال نہرو کے بھی دوست ہیں۔ ہمیں اُس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اتنا کہہ کر وہ اُٹھنے لگے۔ اس موقع پر بخشی صاحب نے ہوش مندی کا مظاہرہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر بخشی شیخ صاحب کے ہمراہ نہیں ہوتے تو

جناح صاحب کے یہاں آنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ بخشی صاحب نے جناح صاحب سے کہا کہ عالی جناب آپ کشمیر آنے کا پروگرام کیوں نہیں بناتے۔ جناح صاحب نے کہا۔ہاں ہاں ۔میں ایسا کروں گا۔ہم پنجاب کا تفصیلی دورہ کرنے کے لئے جائیں گے اور کشمیر بھی آوٴں گا۔اب شیخ صاحب کو بھی یہ دعوت دینا پڑی۔ بہرحال جناح صاحب اپنے وعدے کے مطابق ۱۹۴۴ء میں کشمیر آگئے۔ شیخ صاحب نے اُن کا استقبال کیا اور بہت خاطر تواضع بھی کی۔ چند ہفتے تو معاملات خوشگوار رہے۔ کچھ لوگ مولوی یوسف شاہ کو جناح صاحب سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ وادی میں ان کی بہت عزت تھی۔شیخ صاحب اور عباس ملے اور یہ بات بھی اُڑی کہ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کو مدغم کیا جائے گا۔اس سلسلے میں ہماری میٹنگیں بھی ہوئیں۔ جناح صاحب نشاط باغ سے آگے سید امجد علی کے بنگلے میں مقیم تھے اور شیخ صاحب وہاں بار بار آتے جاتے رہے۔ جناح صاحب نے اُن کو بتایا کہ اگر شیخ اور عباس ایک دوسرے سے مل کر کام کریں تو بہت اچھی بات ہوگی۔شیخ صاحب نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا اور معاملات پر ممبروں کی رائے طلب کی۔ طے پایا کہ شیخ صاحب یہ موقف بنائیں کہ جن لیڈروں نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا تھا وہ ایک جگہ بیٹھیں ۔اگرچہ ہندو ساتھیوں کو اس سے ناراضگی ہوگی مگر شیخ صاحب اُن سے نرمی سے بات کر کے معذرت خواہ ہوں۔شیخ صاحب نے ہندو ممبروں سے کہا کہ جن زعماوٴں نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی منظوری دی، ہم اُن سے الگ ملنا چاہتے ہیں۔اگر وہ مسلم کانفرنس ہی بنانے کے حق میں ہوں تو ہم ہندوؤں سے معافی مانگ کر ایسا ہی کریں گے۔ ورنہ دوسری صورت میں عباس صاحب ہمارے ساتھ مل جائیں۔شیخ صاحب نے کہا کہ اگر نیشنل کانفرنس کو مسلم کانفرنس میں واپس لے جانے کا فیصلہ ہوا تو میں چوہدری عباس صاحب کی قیادت میں ان کے پیچھے رہوں گا۔لیکن دوسری صورت میں

عباس میری سربراہی کو تسلیم کریں گے۔ میٹنگ میں تجویز کو مان لیا۔ دوسرے دن شیخ صاحب اور عباس صاحب کی ملاقات ہوئی۔ شیخ صاحب نے اپنا موقف بیان کیا تو عباس صاحب کچھ ہچکچانے لگے۔ معاملہ جناح صاحب تک پہنچا۔ جناح صاحب نے فرمایا کہ شیخ صاحب کی بات معقول ہے۔ وہ اپنے ہندو ساتھیوں کو چھوڑنے کی قربانی تک دینے پر آمادہ ہیں۔ حالانکہ عباس صاحب کے لئے ایسی کوئی اُلجھن نہیں۔ لیکن عباس مکر گئے اور کہنے لگے کہ ایسے اجلاس میں شیخ صاحب ہی بازی جیت جائیں گے اور میں نیشنل کانفرنس میں جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ معاملہ ایسے ہی لٹکتا رہا۔ بہر حال عباس صاحب اور میر واعظ صاحب نے جناح صاحب کی موجودگی کا فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک جلسہ عام طلب کیا۔ یہ بات طے ہے کہ جناح صاحب کا اُن دنوں کشمیر میں شہرہ پہنچ گیا تھا اور مسلمان اُن کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ تھے۔ بہر حال مسلم کانفرنس کے اس جلسے نے سارے ماجرے کو بدل دیا اور اس سے فضا بگڑ گئی۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو شیخ صاحب جناح صاحب کو عزت سے رخصت کرنے کے لئے خود اُن کو چھوڑنے کے لئے جاتے۔ بہر حال۔ شومئی قسمت سے جناح صاحب نے جامع مسجد کے باہر میدان میں تقریر کی اور میرے خیال میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا۔ اُنہوں نے شیخ صاحب پر تابڑتوڑ حملے کئے۔ جناح صاحب نے کہا کہ میں نے کانگریس کو آزمایا ہے اور اُن کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہوں۔ اب شیخ عبداللہ یہی کچھ کر رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ وہ اپنی اس روش پر بہت پچھتائے گا۔ خود میں نے اپنی ایک ملاقات میں شیخ صاحب کو یہ بات بتائی تھی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں اس بات سے آگاہ ہوں۔ لیکن اس وقت میں ایسا مصلحتاً کر رہا ہوں۔ اُن کی یہ تقریر پریس میں خوب اُچھالی گئی اور شیخ صاحب پر بڑی نکتہ چینی ہوئی۔ شیخ صاحب نے دوسرے ہی روز نواب بازار میں جلسہ کر کے جناح صاحب پر واپس

نشانہ سادھا اور اُن کی کڑی نکتہ چینی کی۔ جناح صاحب معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھے اور پھر وہ کبھی شیخ صاحب سے مفاہمت پر راضی نہیں ہو سکے اور اس کا خمیازہ کشمیری عوام آج تک اُٹھا رہے ہیں۔

اُدھر ۱۹۴۷ء کے بعد ایک اور صورت پیدا ہوگئی۔ نہرو کے دل میں شیخ صاحب کے متعلق نرم گوشہ تھا لیکن سردار ولبھ بھائی پٹیل کا خیال بالکل الگ تھا۔ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کو مظلوم اور شیخ صاحب کو ظالم سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد نے ہمیں یونیورسٹی بنانے کا مشورہ دیا کہ اس سے پہلے ہمارے طلبا پنجاب یونیورسٹی، لاہور اور بعد میں مشرقی پنجاب یونیورسٹی شملہ میں امتحان دیتے تھے۔ مولانا آزاد مرکز میں وزیر تعلیم تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ کیا تمہارے بچے جب عربی کا امتحان دیں گے تو اُن کے پرچے شملہ میں کوئی سربجیت سنگھ کو دیکھنا ہوں گے۔ شیخ صاحب یونیورسٹی قائم کرنے کے مالیاتی بوجھ سے گھبراتے تھے کہ اُن دنوں وہ دلی کے آگے ہاتھ پسارنے کو ناپسند کرتے تھے اور کہتے کہ یہ بنیا لوگ ہر پائی کی قیمت وصول کریں گے۔ There is no free lunch

مولانا آزاد نے ہمت دلائی اور تعلیم کے معاملے میں سر اونچا رکھنے پر زور دیا۔ پہلے خود مولانا آزاد افتتاح کے لئے آئے۔ اُنہوں نے امر سنگھ کالج میں نئی یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشن نے اُس کے بعد سنگِ بنیاد رکھا۔ نہ معلوم وہ پتھر اب کہاں ہے؟

میں نے مولوی صاحب کی آنکھوں کو پتھرانے سے روکنے کے لئے ایک اور باب کھول دیا۔ یہ آئین ساز اسمبلی کیسے بنی؟ جس کے اجلاس کی پہلی ساعتوں میں آپ اُس کی صدارت کی کرسی پر رونق افروز ہو گئے۔

مسعودی صاحب نے مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی جیسے میں نے کوئی بے تمیزی کی ہو۔ وہ بولے۔ آئین ساز اسمبلی کے قیام کا دباؤ دلی سے آیا۔ کیونکہ اُس وقت کے نظم ونسق کا سارا ڈھانچہ بالکل Arbitrary اور کسی سند کا محتاج تھا۔ ایک طرف شیخ

صاحب کچھ اور عوام پر ور قانون بنانا چاہتے اور کشمیر کے خاص مرتبے کو قلعہ بند کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے جواہر لال نہرو عالمی دباؤ سے کہ کشمیر میں الحاق ہند کی عوامی توثیق کی جائے گی' کا وعدہ پورا کرنا چاہتے تھے۔ اُنہیں اب معلوم تھا کہ استصواب میں ہندوستان کے حق میں فیصلہ شیخ صاحب کے ہوتے ہوئے بھی دشوار ہوگا۔ لہٰذا ایک سراب کھڑا کر کے عالمی دباؤ کا رُخ موڑ دیا جائے۔ شیخ صاحب نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ کشمیر میں اُن دنوں بس نیشنل کانفرنس ہی سیاسی میدان میں دندنا رہی تھی۔ باقی جماعتیں یا ہجرت کر گئی تھیں یا اُن کے چلانے والے سلاخوں کے پیچھے بند تھے۔ اس لئے کسی نشست پر کوئی مقابلہ ہی نہ ہوا کہ کوئی اُمیدوار سامنے نہیں تھا۔ یووک سبھا کے شونرائن فوطیدار اکلوتے اُمیدوار تھے جنہوں نے حبہ کدل' جہاں اُن کے ہم خیال پنڈتوں کی بڑی تعداد رہتی تھی' سے فارم بھرا۔ مگر اُن سے بات ہوئی۔ اُنہیں پارلیمنٹ میں بھیجنے کا سندیسہ دیا گیا اور وہ اپنا کمنڈل شیتل ناتھ میں چھوڑ کر نیشنل کانفرنس میں داخل ہو گئے۔ جموں میں ڈپٹی کمشنروں نے اکثر اُمیدواروں کے کاغذات مسترد کر دیئے۔ جموں میں پرجا پریشد نے پروٹسٹ کیا اور اپنے کاغذات واپس لے لئے۔ جموں شہر کی دو نشستوں پر دو عورتوں کو ہم نے اُمیدوار بنایا اور وہ چناؤ لڑ کر کامیاب قرار پائیں۔ اکھنور میں بھی ہمارا اُمیدوار لڑ کر جیت گیا۔

اب مولوی صاحب کچھ اُکتا گئے تھے۔ اُنہوں نے مروتاً ایسا کہا نہیں لیکن اُن کے ماتھے کے بل اور اُن کی آنکھوں کا اظہار گواہی دے رہے تھے۔ میں نے کچھ نہایت اہم سوال چھوڑ کر اُن سے پوچھا۔ مولوی صاحب شیخ صاحب سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی؟

وہ بولے۔ ۲۷/ اگست ۱۹۸۲ء کو اُن کے اُس کمرے میں جہاں وہ بستر علالت پر دراز تھے۔ کچھ تو بیگم اکبر جہاں صاحبہ نے ایسا کرنے کی خواہش مجھ تک

پہنچادی تھی اور کچھ میں بھی عیادت کی سنت نبھانا چاہتا تھا۔ میرے ساتھ میرے پوتے پوتیاں بھی آئیں اور جب میں شیخ صاحب کے یہاں پہنچا تو میں نے شیخ نذیر احمد سے التماس کی کہ وہ شیخ صاحب سے عرض کریں کہ میرے ساتھ میرے بچے بھی آئے ہیں اور اُن کا اصرار ہے کہ اُن کو بھی میرے ساتھ اندر آنے کی اجازت ملے۔ نذیر صاحب اندر گئے اور کہا کہ شیخ صاحب کہتے ہیں کہ ہاں سب چلے آیئے۔ ہم اندر گئے تو شیخ صاحب نے بچوں کو پچکارا اور اُن کے ساتھ لگے رہے۔ بیگم صاحبہ نے سہارا دیا اور اُٹھ کر تکیے سے ٹیک لگائے رہے اور بچوں کو پیار کرتے رہے۔ بچوں نے کیمرے ساتھ لائے تھے۔ اس کی تصویریں بھی کھینچی۔ جن میں میں بھی شیخ صاحب کے ساتھ بیٹھا نظر آتا ہوں۔ شیخ صاحب نے بیگم صاحبہ، خالدہ جی، ثریا جی کو بھی بلایا اور نذیر صاحب نے ہم سب کی تصویریں لیں۔ اسی دوران ڈاکٹر غلام قادر علاقہ بند دو چار اور ڈاکٹروں کے ساتھ نمودار ہو گئے۔ میں نے مسکرا کر شیخ صاحب سے کہا کہ جناب آپ تو ماشااللہ چاق وچوبند نظر آتے ہیں یہ ڈاکٹروں کا کیا ماجرا ہے۔

شیخ صاحب کمزور آوز میں بولے۔ آپ فکر مند نہ ہوں یہ بس ایک Routine Checkup ہے؟

بہر حال، ڈاکٹر صاحبان نے کام شروع کیا تو ہم نے رخصت چاہی اور میں ایک عجیب قلبی کیفیت کے ساتھ نکل آیا۔ میں نے مسعودی صاحب کی اُکتاہٹ سے گھبرا کر آخری سوال پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں کشمیر کی تواریخ میں شیخ صاحب کا کیا مرتبہ رہے گا۔''

مولوی صاحب کچھ دیر کے لئے چپ ہو گئے۔ وہ شاید اپنے ذہن کو جواب کے لئے غور سے ٹٹول رہے تھے۔

یہ آئندہ نسلوں کی توفیق کا معاملہ ہے۔ اُن کی تربیت کیسے ہوگی اور اُن کے

پیمانوں کا اندازہ کیا ہوگا۔ لیکن اگر انجمن سلامت رہی تو آئندہ پانچ سو برسوں تک اُن کا قد و قامت بلند رہے گا۔ لیکن اگر پیمانے بگڑ گئے تو اُن کے مرتبے میں بھی فرق آسکتا ہے۔

میں نے کھڑا ہوتے ہوئے کہا کہ مولانا ...... کشمیر کو شیخ صاحب کی عطا Contribution کیا ہے؟

کچھ تو مولوی صاحب جلد جلد اپنا دامن جھاڑ کر خلاصی حاصل کرنا چاہتے تھے اور کچھ یہ سوال ہی اتنا Loaded تھا کہ وہ بول اُٹھے۔ بھئی اتنی ہمہ گیر اور ہمہ رنگ شخصیت کے اُجلے اور کچھ کم اُجلے پہلو ہیں کہ اُن کی وضاحت وصراحت کرتے ہوئے زبان کے گنگ ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کی شخصیت اور عطا کا محاکمہ برسوں تک ہوتا رہے گا۔ آیئے۔ ہم اس مشکل کام کی ذمہ داری نئی نسلوں کے ہی سپرد کردیں۔

مولانا اُٹھے اور مجھ سے آنکھ ملائے بغیر دروازے کی طرف لپکے، میں پیچھے رہ کر سٹپٹا تا رہ گیا۔

☆☆☆

☆......ڈاکٹر عبدالواحد

مولانا مسعودی...... کشمیر کی سیاست کا ایک اہم کردار

۱۹۶۴ء میں سارا کشمیر ابل پڑا تھا۔ درگاہ حضرت بل سے موئے مقدس کی گمشدگی نے نہ صرف وادی بلکہ کم وبیش سارے برصغیر کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ پوری آبادی سڑکوں پر نکل آئی تھی۔ لوگ مشتعل بھی تھے اور ماتم کناں بھی۔ موئے مقدس کی بازیابی کے لئے ایک زبردست تحریک نے جنم لیا تھا۔ کشمیر کے افقِ سیاست پر میرواعظ خاندان کی ایک نوعمر شخصیت ابھر آئی۔ یہ شخصیت میرواعظ مرحوم مولانا فاروق کی ذات تھی لیکن چونکہ وہ سیاسی لحاظ سے نوزائید تھے اور تجربے کے لحاظ سے طفلِ مکتب' اس لئے کشمیر کی اس بے مثال اتھل پتھل میں ایک مفکر' تجربہ کار اور دانشور قائد کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو مولانا مسعودی کی فکر انگیز قیادت نے پورا کیا۔ ان کے تجربے کا فیض کشمیر کے نوجوانوں اور ابھرتے ہوئے سیاسی کارکنوں تک پہنچا۔ مولانا فاروق کی شخصیت بھی ان کی صحبت میں سنور گئی اور وہ کشمیر کے منجھے ہوئے سیاست دان کی شکل میں متعارف ہوگئے۔

میں نے مولانا مسعودی کو اسی تحریک کے دوران پہلی بار دیکھا۔ جامع مسجد سرینگر کی مسلم پارک میں ہزاروں لوگوں کے سامنے اُن کی تقریریں آج بھی ذہن میں گونج رہی ہیں۔ شدید سردی' یخ بستہ ہواؤں اور برفباری کے باوجود لوگ ان کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتے تھے۔ ان کی تقریر مفصل اور مدلل ہوتی تھی اور لوگ پوری توجہ کے ساتھ گھنٹوں جلسہ گاہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ عام طور پر جب لیڈر لوگ تقریریں

کرتے ہیں تو لوگ جلسہ گاہ سے اُٹھتے بھی ہیں۔ کچھ چلے جاتے ہیں۔ کچھ دوبارہ آجاتے ہیں لیکن مولانا کی تقریر کے دوران لوگ بت بن کر ایک جگہ ساکت ہو کر رہ جاتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ کوئی استاد اپنے شاگردوں کے سامنے ان کو زندگی کے رموز اور آداب سکھا رہا ہو۔ وہ سیاست کے ساتھ ساتھ ادب اور اخلاقیات کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ وہ حالات اور واقعات کا تجزیہ کر کے لوگوں کے ذہنوں کو منور کرتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت میں ہمہ گیریت تھی۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ مولانا مسعودی ہماری ریاست اور سیاست کے مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ دونوں کی خطابت لامثال ہوا کرتی تھی۔ دونوں کی بلاغت اور فصاحت کا کوئی ثانی نہیں۔

دارالعلوم دیو بند کا ہندوستان کی سیاست میں ایک اہم اور مسلمہ رول رہا ہے۔ دیو بند سے وابستہ علما عام طور پر متحدہ قومیت کے علمبردار رہے ہیں۔ مولانا مسعودی بھی متحدہ قومیت میں یقین رکھتے تھے اور دو قومی نظریّے کے زبردست مخالف تھے۔ یہ دارالعلوم دیو بند سے وابستگی کا نتیجہ تھا یا مولانا کی ذاتی فکر اور تفہیم کا نتیجہ، یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ کشمیر کے ایک دوسرے بڑے عالم میر واعظ یوسف شاہ مرحومؒ بھی دیو بند سے تعلیم حاصل کر کے واپس وطن لوٹے تھے۔ لیکن انہوں نے دیو بند کی سیاسی فکر کو قبول نہیں کیا تھا۔ انہوں نے دو قومی نظریّے کی زبردست وکالت کی تھی اور میر واعظ مرحوم نے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اس معاملے پر ٹکر بھی لی تھی اور تصادم آرائی ہماری ریاست اور سیاست کا ایک اصولی محور بن کے رہ گئی اور یہ تصادم آج تک جاری ہے۔

مولانا مسعوی جب تحریک موئے مقدس کی قیادت کر رہے تھے تو کشمیر کی مسلمہ لیڈر شپ اور اعلیٰ قیادت کشمیر سازش کیس کے سلسلے میں نظر بند تھی۔ شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ اور دوسرے زعما اسیری کے دن کاٹ رہے تھے۔ مولانا

مسعودی کشمیری زبان نہیں بولتے تھے اور یہ وہ دور تھا جب عام لوگ اردو کو آسانی سے نہیں سمجھتے تھے لیکن مولانا نے اپنی فصاحت کا سہارا لے کر زبان اور بیان کو عام لوگوں تک پہنچانے کا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا اور لوگوں کو عمومی طور ان کی تقریریں سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی۔ اُن کی تقریروں میں ایک جادو ہوتا تھا۔

مولانا مسعودی شیخ محمد عبداللہ کے معتقد بھی تھے اور نقاد بھی لیکن انہوں نے تنقید کو کبھی عوامی یا بازاری مسئلہ نہیں بنایا۔ ان کی تنقید میں تلخی کا کوئی عنصر نہیں ہوتا تھا۔ وہ سیاسی اختلافات کے باوجود اخلاقیات کا دامن مضبوطی سے تھام لیتے تھے۔ جب جنتا تحریک کے دوران شیخ صاحب علیل ہو گئے تو متضاد نظریات اور زبردست اختلافات کے باوجود وہ ان کی عیادت کے لئے ان کے گھر گئے اور وہاں کچھ دیر تک قیام بھی کیا۔ یہ وہ دور تھا جب لوگوں کی ترجیحات ہی نہیں لوگوں کے جذبات بھی تقسیم ہو کر رہ گئے تھے اور مخالفین کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا یا بات کرنا ایک ناممکن سا معاملہ بن گیا تھا۔ لیکن مولانا ہر معاملے میں وقار اور معیار کو قائم رکھتے تھے۔ وہ سیاسی شعبدہ بازیوں میں نہیں بلکہ پختہ سیاسی افکار میں یقین رکھتے تھے۔

موئے مقدس کی تحریک ابتدائی ایام میں خالصتاً موئے مقدس کی بازیابی تک محدود رکھی گئی تھی۔ مولانا کی تقریریں صرف اسی معاملے پر مرکوز ہوا کرتی تھیں اور تحریک کے ابتدائی ایام کے دوران مولانا نے کشمیر کے سیاسی مسئلے اور اس کے مستقبل کے بارے میں اپنے افکار کو التوا میں رکھا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مولانا مسعودی تقریر کر رہے تھے تو سامعین میں ایک نوجوان طالب علم اُٹھ کھڑا ہوا اور کشمیر کے سیاسی مستقبل کے بارے میں زبردست نعرہ بازی شروع کر دی۔ بہت دیر تک ہنگامہ جاری رہا۔ پھر ''ہوشیار ہوشیار'' کے نعروں سے جلسہ گاہ میں پھر سے سکوت طاری ہوا تو مولانا اس طالب علم سے مخاطب ہوئے۔ ''یہ جو نعرہ آپ نے ابھی دیا۔ ہم وقت آنے پر اسی

سٹیج سے یہ نعرہ بلند کریں گے۔ اذان بھی دینی ہو تو وقت پر دی جاتی ہے۔ وقت سے پہلے نہیں۔ جب عبادت کے معاملے میں وقت کا تعین ہے تو سیاسی معاملات میں بھی وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جب ہم کھیت میں کام کرتے ہیں تو موسم کے حالات کو مدنظر رکھتے ہیں۔ زمین پر برف ہو تو ہم زمین میں بیج نہیں بوتے۔ برف ہٹا کر بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ بیج فصل نہیں دے گی بلکہ سڑ جائے گی اور ساری محنت رائیگاں ہو کر رہ جائے گی۔ ایک کسان مناسب موسم کا منتظر رہتا ہے اور پھر کھیتی باڑی کا کام شروع کر لیتا ہے۔ اسی طرح سیاسی معاملات کے لئے وقت اور ماحول کا مناسب ہونا ضروری ہوتا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ اور کشمیر کی ساری قیادت جیلوں میں نظر بند ہے۔ ہم وقت آنے پر ان کی رہائی کے لئے تحریک شروع کریں گے اور پھر وہ قوم کی قیادت سنبھالیں گے۔ آپ اس وقت ایک طالب علم ہیں۔ پہلے اپنی تعلیم کو مکمل کر لو۔ ہمیں ایک ایسے سماج کی ضرورت ہے جو تعلیم یافتہ ہو۔ تعلیم یافتہ لوگ ہی قوموں کی امامت اور اپنے وطن کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اگر آپ نے تعلیم کی بجائے سیاست کے خار زار میدان میں قدم رکھا تو آپ کا تعلیمی کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ آپ کو بقول شاعر "نہ خدا ہی ملے گا نہ وصال صنم"۔

مولانا کی اس فکر انگیز تقریر سے سامعین پر جادو طاری ہو گیا اور لوگ پوری توجہ کے ساتھ ان کے ایک ایک لفظ کو غور سے سُنتے رہے۔

مولانا مسعودی ہماری سیاسی تحریک اور تاریخ کے اہم کردار رہے ہیں۔ کچھ لوگ ان پر مصلحت آمیزی کا الزام لگاتے ہیں لیکن وہ مصلحت نہیں مصالحت اور شرافت میں یقین رکھتے تھے۔ لوگ ان کی سادہ زندگی اور سادہ مزاجی کی آج بھی مثالیں دیتے رہتے ہیں۔ انہوں نے سیاست کے میدان میں پرہیزگاری کو اپنا شعار بنایا تھا اور اپنے دامن کو سیاسی آلودگیوں سے بچانے میں کامیاب اور کامران رہے۔

اُن کے سیاسی نظریات کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن کشمیر میں ان کے سیاسی رول اور ان کی سیاسی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور لوگ ان کو ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔ کشمیر کا تذکرہ ان کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔

☆☆☆

☆......اپنی نگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ/یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔

(ادارہ)

☆☆☆

☆......ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ شاہ

مولانا مسعودی...... تنظیم ساز اور معاملہ فہم شخصیت

۱۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو ایک نوے سالہ بزرگ اسکالر مولانا مسعودی کی زندگی کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گُل کر دیا گیا۔ اُس روز کی نماز عصر اُس کی حیاتِ مستعار کی آخری نماز اور بارگاہ ایزدی میں آخری بار سر بسجود ہونا ثابت ہو گیا۔ ریاست جموں و کشمیر ایک نابغہ روزگار محقق اور اسکالر سے محروم ہو گئی۔

مولانا مسعودی نے اپنی عمر کی تیسویں بہار دیکھنے سے پہلے پہل ہی پرنس آف ویلز کالج جموں میں عربی کے درس و تدریس کے فریضہ کو خیر باد کہہ دیا اور مطلق العنان حکومت کے خلاف اُٹھنے والی پہلی تحریک میں ایک تنظیم ساز شخصیت کی حیثیت سے شامل ہو گئے جس نے آگے چل کر "کشمیر چھوڑ دو تحریک" کا روپ دھار لیا۔ آپ اُن صفِ اول کے رہنماؤں میں شامل تھے جنہوں نے مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی جسے بعد میں نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا۔ مولانا مسعودی تیس سالہ طویل عرصے تک اس پارٹی کے جنرل سیکریٹری کے منصب پر فائز رہے۔ اعلیٰ دانشورانہ تعمق، سیاسی بالیدگی، وسعتِ نظری، دور اندیشی، تنظیم سازی، معاملہ فہمی اور روحانی تفوق جیسی ممتاز صفات کے حامل ہونے کی بنیاد پر انہیں اپنے ساتھیوں اور دوست واحباب کی نظروں میں عزت و تکریم حاصل تھی۔ آپ کی ذات میں ایک کرشمائی رہنما بسا تھا جس نے سیاست کو سادگی اور سماجی خدمات، قوت و طاقت کو رحم و کرم اور شفقت و مودت اور اقتدار و اختیار کو ذمہ داری اور جوابدہی کے معنوں میں ڈال دیا۔ اپنے تمام ہم عصر اور ہم

وطن ساتھیوں میں انہیں جو چیز اعزاز وامتیاز بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کبھی عہدہ ومنصب، طاقت واقتدار اور دولت وثروت کے طلبگار نہیں رہے ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف آپ کے ناقدین اور مخالفین کو بھی ہے۔ آپ نے اپنے غیر مبہم اور شستہ سیاسی نظریہ اور خیالات کو اپنے ہم عصر اور ساتھی سیاستدانوں کی معیوب طرزِ سیاست اور مکدر سیاسی خیالات سے پراگندہ ہونے کی اجازت کبھی نہیں دی۔

سات دہائیوں پر محیط اپنے سیاسی سفر کے دوران آپ کئی کلیدی مناصب پر فائز رہے جن میں نیشنل کانفرنس کے ترجمان اعلیٰ، جنرل سیکریٹری، سرپرست اعلیٰ اور حلقہ انتخاب سرینگر کے ممبر پارلیمنٹ قابل ذکر ہیں۔ مگر ان تمام مناصبِ اعلیٰ پر فائز ہونے کے باوجود آپ کی سرشت میں موجود عنصرِ فقیری کبھی متاثر نہ ہوسکا۔

تنظیمی حلقوں میں آپ مردِ بحران کے نام سے جانے جاتے تھے۔ جب کبھی بھی تنظیم کو نازک اور مشکل ترین حالات درپیش رہے تو تنظیم کو بہر حال مولانا کی قابلیت وصلاحیت پر تکیہ کرنے اور بروئے کار لانے کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا ہے اور مولانا ہمیشہ نازک حالات کو بہتر ڈھنگ اور بعنوان شائستہ سنبھالنے میں کامیاب رہے ہیں جس کی برجستہ مثال موئے مقدسؐ کی بازیابی کی تحریک میں ان کا قائدانہ کردار ہے۔

معروف مورخ رشید تاثیر کے مطابق مولانا مسعودی جموں وکشمیر اردو صحافت کے سابقون الاولون میں سے ہیں۔ آپ کی ادارت میں کئی اخبار اور رسالے شائع ہوئے جن میں "ہمدرد"، "خدمت" اور "خالد" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حالات وواقعات کے زود فہم تجزیئے، بے باک تنقید، غیر جانبدارانہ تبصرے، ہوش رُبا اداریئے لکھنے کا چلن یہاں کے مقامی میڈیا میں رائج کرنے کا سہرا مولانا کے ہی سر ہے۔ ایک معزز عالم دین، مؤثر مقرر اور فن خطابت کے پیچ وخم سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ادبی میدان بالخصوص شعر وشاعری کے بھی شہسوار تھے۔ علامہ اقبالؒ کی حکیمانہ اور فلسفیانہ شاعری پر گہری بصیرت اور دسترس کے

حامل مولانا مسعودی نے خود بھی کئی مذہبی تنظیمیں بنائیں اور حُب الوطنی کے نغمے لکھے ہیں۔
سیاسی زندگی کے دورانیہ میں آپ کا ایک فیصلہ لغزش تصور کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کے ریاستی یونٹ کے کنوینئر کا عہدہ قبول کرلیا۔ ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کی طرف سے برپا کی گئی ملک گیر اور زوردار ایمر جنسی مخالف مہم نے ریاست کے سیاسی حالات کو بھی اثر انداز کردیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں شیخ محمد عبداللہ کی طرز سیاست اپنی ڈگر سے ہٹ چکی تھی۔ مولانا نے موقعہ غنیمت جان کر شیخ عبداللہ کا توڑ کرنا چاہا۔ جنتا پارٹی کے ساتھ پینگیں بڑھانا شاید ایک ناکام اور لایعنی تجربہ ثابت ہوا ہو لیکن اس سے ریاست میں باوزن اور گونج دار حزبِ مخالف کے وجود میں آنے کی راہ ہموار ہوگئی۔ یہاں کے سیاسی اُفق پر پیوپلز پارٹی اور پینتھرس پارٹی جیسی تنظیمیں نمودار ہوگئیں۔

تاریخی حضرت بل سازش کے حوالے سے مولانا مسعودی کا بین الاقوامی مبصرین کے سامنے جموں و کشمیر کے حل طلب مسئلے پر دیا گیا بیان ایک ٹھوس اور مسلمہ حقیقت ہے جسے معروف اخبار روزنامہ ''زمیندار'' امرتسر نے اپریل ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے۔ مولانا کا یہ بیان منقسم ریاست کے باہمی روابط اور میل ملاپ کی اہمیت اور ضرورت کو اُجاگر کرتا ہے۔ طبقاتی اور علاقائی بنیادوں پر ریاست کی تقسیم کو مسترد کرتا ہے دونوں ہمسایہ ممالک بھارت اور پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر اور کشمیریوں کے ساتھ کئے گئے وعدوں کی یاد دہانی اور ایفاء پر زور دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زور زبردستی اور من چاہے فیصلے لوگوں پر تھوپنے سے خبردار کرتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے ''آزاد جموں و کشمیر'' کے نظریہ کی حمایت کی ہے اور یہاں تک کہ بھارتی پارلیمنٹ میں بحیثیت پارلیمنٹ ممبر جموں و کشمیر کو Buffer State بنانے کی اصطلاح بھی استعمال کی۔

ایک مشہور کتاب ''Article 370'' کے مصنف اے۔ جی۔ نورانی کے مطابق ۱۹۴۷ء میں شیخ عبداللہ کی ایمر جنسی انتظامیہ کے دوران مولانا مسعودی نے

''آزاد جموں و کشمیر'' جسے مسئلہ کشمیر کے حل کے حوالے سے آج تیسرے متبادل کے نام سے جانا جاتا ہے' پر رائے عامہ ہموار کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن شیخ عبداللہ کی موجودگی میں وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مولانا کی خدمات اور قدو قامت کی قدر دانی کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی نے مولانا کو بھارت کے نائب صدر کے عہدے کی پیشکش کی تھی لیکن مولانا نے بڑی شائستگی اور شکریہ کے ساتھ اس پیشکش کو یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کیا کہ وہ کبھی بھی کسی عہدے' منصب' اقتدار اور جاہ و حشمت کے طلبگار نہیں رہے ہیں۔ ایسا کرنا صرف مولانا جیسے عزم صمیم اور مقتدر شخصیت کا ہی خاصا ہو سکتا ہے جنہوں نے فیصلہ سازی اور قوتِ شناخت پر حرص و طمع اور جذبات کو کبھی غالب نہیں آنے دیا۔

مولانا کی ذات نمود و نمائش اور ریاکاری سے کوسوں دور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی اہم اور کلیدی منصبوں پر فائز رہنے کے باوجود نہ کبھی دورانِ حیات اور نہ بعد انتقال ہی وہ یہاں کے میڈیا کی زینت بنے اور نہ نجی و سرکاری محفل و مجالس میں موضوعِ بحث بنے۔ اُنہیں اُس پارٹی نے عملاً و قصداً گوشہ غفلت اور طاق نسیان کی نذر کر دیا جس کی تنظیم سازی اور نظم و نسق چلانے کے لئے اُنہوں نے اپنی زندگی کے سنہرے چالیس سال صَرف کئے ہیں۔ جامع مسجد گاندربل کے صحن میں واقع آپ کا مدفن آج بھی بزبانِ حال مولانا کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کا دکھڑا سُنا رہا ہے۔ مولانا کی قبر پر نصب کیا گیا کتبہ کسمپرسی کی حالت ایک طرف اکھڑا پڑا ہوا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح اُن کے پیچھے چھوڑے ہوئے سیاسی نظریہ کا کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔

برمزارِ ماغریباں نے چراغِ نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

☆☆☆ (ترجمہ: ارشد حسین)

☆......قاضی محمد امین

مولانا مسعودی...... عظیم مفکر اور عالمِ دین

مولانا محمد سعید مسعودی اُن معزز اور باوقار ہستیوں میں سے ہیں جن کی یاد کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ وہ غیر معمولی اور کمیاب اشخاص میں سے تھے۔ اُن کی ایک تہہ دار شخصیت تھی۔ وہ بیک وقت ایک عظیم مُفکر، ایک عالمِ دین، ایک منجھے ہوئے سیاسی رہنما، ایک اعلیٰ پایہ کے مُقرر اور ایک اچھے انسان تھے۔ ایک اچھا انسان بننا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ بقولِ شاعر۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

مولانا مسعودی میں قائدانہ صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ وہ ایک پُروقار شخصیت کے مالک تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کی شخصیت مقناطیسی تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ کشمیر کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے جو علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ آپ کی پیدائش ماہِ شوال ۱۳۲۲ھ میں ہوئی۔ آپ نے ایک مذہبی اور اخلاقی ماحول میں تربیت پائی جس کا عکسِ جمیل آپ کی تحریروں اور تقریروں میں نمایاں نظر آتا تھا۔ اُن میں علمی اور ادبی ذوق کمسنی میں ہی پیدا ہوا جس کی بدولت آپ ایک جیّد عالم بنے۔

مولانا مسعودی کے جدِ امجد شاہ مسعود بغدادیؒ تھے جو سرینگر کے محلہ نزورہ میں مدفون ہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مولانا مسعودی نے امرتسر اور لاہور میں عربی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مولانا کا حافظہ کمال

کا تھا۔آپ کے علم وفضل کا سب کو احترام تھا۔ جلسے جلوسوں میں آپ کا اپنا ایک مخصوص فلسفیانہ اندازِ بیان ہوتا تھا اوران کی فکر انگیز تقاریر نے اُن کی مفکرانہ شخصیت کو عوام کے سامنے لایا۔

صدر الدین مجاہد نے اپنی کتاب ''یادِ رفتگاں'' میں لکھا ہے کہ ''میں نے تحریکِ آزادی میں کچھ بولنا' لکھنا یا جرأت مندی سے آگے آنا سیکھا ہے۔ یہ سب قبلہ مولانا مسعودی کے طفیل مجھے حاصل ہوا''۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب ہم لاہور میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے ہاں جاتے' وہ مولانا مسعودی کی عزت کرتے تھے۔میں نے دیکھا کہ ''زمیندار'' کے ایڈیٹر اور مشہور صحافی علامہ ظفر علی خان مولانا کو دیکھ کر کھڑے ہو کر مصافحہ کرتے اور مختلف جماعتوں کے سیاسی لیڈر اور بڑے بڑے اخبارات کے مدیر اور دوسرے لوگ مولانا سے کافی احترام سے پیش آتے تھے''۔

مزید لکھتے ہیں:

''قدرت نے آپ کو اس قدر قابلیت سے نوازا تھا کہ آپ بہترین مقرر ہونے کے علاوہ جو کچھ بھی تحریر فرماتے وہ عالمانہ اور مفکرانہ رائے مانی جاتی تھی''۔

مولانا مسعودی جب لاہور سے سرینگر آئے تو نیشنل کانفرنس کے مختلف عہدوں پر کام کرنے کے بعد جنرل سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔آپ نے دہلی میں بھی قیام کیا جب آپ رُکنِ پارلیمنٹ تھے۔وہ سیاست کے رموز سے آشنا تھے اوراُن کی گفتگو بہت پُر اثر ہوا کرتی تھی۔

زیارتِ حضرت بل سے موئے مقدس کی گمشدگی کے دوران وہ میدان میں آئے۔اُن ایام میں لال چوک (سرینگر) میں آپ کی قیادت میں جلسے اور جلوس نکالے جاتے تھے۔مولانا اپنی دلنشین تقریروں سے ایک جم غفیر کو وجد میں لاتے۔مجھے

اچھی طرح سے یاد ہے کہ اگر کہیں سے جلسے میں گڑ بڑ کی آواز سنائی دیتی تو ''ہوشیار'' کا نعرہ سُن کر لوگ خود بخود خاموش ہو کر آپ کی تقریر سُننے میں مشغول ہو جاتے۔

راقم الحروف کو بھی کئی بار گاندربل میں اُن کی رہائش گاہ پر اُن کے خیالات اور اقوال سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ آپ کی گفتگو اس قدر پُر اثر اور پُر لطف ہوتی تھی کہ سُننے والا مسحور ہو جاتا تھا۔ دینی اور دُنیوی مسائل پر اُن کے افکار و خیالات جاننے کا موقعہ جب کبھی بھی ملتا تھا تو مجھے قلبی اور روحانی تسکین ملتی تھی۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء کے دن جب وہ اپنے گھر واقع گاندربل میں بستر علالت پر تھے۔ کسی شخص نے اُن کو گولی مار کر ابدی نیند سُلا دیا۔ اِنا للہِ و اِنا الیہ راجعون۔ اُس وقت آپ کی عمر نوے (۹۰) سال تھی۔

آپ کی آخری قرار گاہ گاندربل میں بر لب سڑک دودرہامہ مسجد کے قریب واقع ہے۔

تمہیں کہتا ہے مُردہ کون تُم زندوں کے زندہ ہو
تُمہاری خوبیاں زندہ تُمہاری نیکیاں باقی

مولانا کی شہادت میں جو مرثیہ لکھا گیا ہے اُس کے چند اشعار یوں ہیں۔

کہکشانِ علم کا اِک آفتابِ تابدار — اور علومِ دین و حکمت کا وہ بحرِ بے کنار
وہ مُفکر، وہ مدبر وہ خطیبِ بے بدل — جس کی ہر تقریر ہوتی تھی ادب کا شاہکار
ہمنشین مت پوچھ ہم سے حالِ زار اُس وقت کا — جب کیا مظلوم کو ظالم نے گولی کا شکار
ہو گئے ہم سے جُدا افسوس مسعودی سعید — چشمِ شاعر اُن کے غم میں بن گئی ہے جوئے بار

یا الٰہی جب تلک یہ گردشِ دوراں رہے
اُن کی تُربت پر ہو نازل تیری رحمت بے شمار

☆☆☆

☆......شبنم قیوم

کشمیر کی تاریخ و تحریک کے چشم دید گواہ

مولانا محمد سعید مسعودی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت کے لحاظ سے نرم، نیک، شریف النفس، بے لاگ، قناعت پسند اور بڑے ہی حلیم تھے۔ ان کے اندر لالچ کا ذرہ بھی موجود نہیں تھا۔ دِکھاوے کے بالکل قائل نہ تھے۔ میں نے ذاتی طور ان کے ساتھ کئی ملاقاتیں کیں (۱۹۷۶ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک) جب میں کشمیر کی تاریخ اور تحریک سے متعلق مواد جمع کر رہا تھا۔ گاندربل میں اپنے پرانے مکان کے ایک کمرے میں گاؤ تکئے کے ساتھ ٹیک لگائے اپنے سامنے لکڑی کا بکس رکھتے تھے۔ اس بکس سے وہ لکھنے پڑھنے کے ٹیبل کا کام لیتے تھے۔

مولانا صاحب میرے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے، بہت کچھ بتاتے، سمجھاتے مگر اپنے پاس رکھے بکس میں سے کبھی کچھ نکال کر نہیں دیا۔ جب میں ان کے سامنے اس بکس میں سے کوئی اہم ورق نکالنے کا تقاضا کرتا تو وہ کچھ اس طرح ٹالتے کہ میں بے بس ہو جاتا۔ البتہ کئی ملاقاتوں کے دوران جب میں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا تو انہوں نے میرے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ میرے اس بکس میں جو کچھ بھی ہے وہ میں آپ کو دوں گا اور کسی کو نہیں۔ اس بکس کا حقدار غالباً انہوں نے مجھے اس وقت جانا جب میں نے ''کشمیر کا سیاسی انقلاب' کی پانچ جلدیں منظر عام پر لائیں اور ان کا مطالعہ کرنے کے بعد' ان کا یہ کہنا کہ میں آپ کے اس کام کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے بعض ایسے پوشیدہ گوشے وا کیئے ہیں جن کی مجھے بھی خبر نہیں اور میرے پاس اس کے بغیر بھی جو خزانہ

موجود ہے وہ میں آپ کو ضرور دوں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔ کیونکہ میں اس سارے خزانے کی حفاظت کر رہا ہوں۔ میں نے مولانا سے استدعا کی کہ وہ اس مواد کو کتابی صورت میں محفوظ کریں تاکہ یہ ضائع ہونے سے بچ سکے۔ اس کے جواب میں انہوں نے بتایا میں خود یہ کام نہیں کروں گا یہ کام آپ کریں گے۔

اگر آپ مجھ پر اس قدر بھروسہ کرتے ہیں تو کل کیوں، آج ہی مجھے یہ خزانہ عنایت کیجئے تاکہ سند رہے۔ لیکن مولانا نے کل کل کر کے جب موت کا جام پی لیا تو ان کے ساتھ ان کا یہ بکس بھی غائب ہو گیا۔ ایک روز میں نے ان کے برادرِ اصغر سے اس بکس کے بارے میں پوچھا تو وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔

مولانا مسعودی نے زبانی مجھے بہت کچھ بتایا۔ ان کا ماننا تھا شیخ محمد عبداللہ کے سامنے میں بھروسہ مند بھی تھا اور بے بھروسہ بھی۔ شیخ صاحب مجھ پر بہت زیادہ اعتبار بھی کرتے تھے اور بے اعتبار بھی مانتے تھے۔ مولانا سے جب میں نے ان کے بارے میں اتنے بڑے تضاد کی وضاحت طلب کی تو وہ بس اتنا بولے۔ شیخ صاحب آخر کار ایک انسان تھے۔ انسان سے لغزشیں ہوتی رہتی ہیں۔ مجھے جاننے اور سمجھنے میں اگر انہیں لغزش ہوئی تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مولانا محمد سعید مسعودی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مدرس تھے۔ سیاست میں قدم رکھنے کا باعث جولائی ۱۹۳۱ء کا وہ سانحہ ہے جو سنٹرل جیل سرینگر کے پاس ۲۲ کشمیریوں کی شہادت کے ساتھ کشمیر کی تاریخ میں درج ہو چکا ہے۔

تاریخِ کشمیر کے اوراق بتاتے ہیں کہ ۲۴ جون ۱۹۳۲ء کے روز جب شیخ محمد عبداللہ کو دوبارہ گرفتار کیا گیا تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے، مظاہروں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کو سنٹرل جیل سرینگر پہنچایا گیا۔ شہر میں دفعہ ۱۹/ایل نافذ کیا گیا (جو دفعہ ۱۴۴ کے متوازن تھا)۔ ٹھاکر کرتار سنگھ جو مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے مختارِ کل

تھے۔ انہوں نے ضیا الدین پونچھی، گوہر رحمان، شیخ محمد عبداللہ اور دیگر رہنمایانِ قوم کو گرفتار کیا۔ احتجاجی مظاہرین پر سرینگر، اسلام آباد، سوپور، بارہمولہ، ہندواڑہ، بانڈی پورہ اور شوپیان کے علاوہ اوڑی، مظفر آباد، پونچھ وغیرہ علاقہ جات میں ڈنڈے برسائے اور جب ہجوم بے قابو ہو گئے) تو گولیاں بھی چلائی گئیں۔ اس گولہ باری سے کئی لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے اور مختلف مقامات پر ایک سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ لولاب کے عالم دین مولانا سلیمان شاہ اور مولانا محمد یوسف شاہ کو گرفتار کر کے سنٹرل جیل پہنچایا گیا۔ سوپور سے مولوی محمد یاسین، حاجی رحیم ڈار، صوفی محمد اکبر، محمد رجب بخش، مظفر آباد سے پیر حسام الدین، حاجی قلندر شاہ اور ماسٹر عبدالعزیز گرفتار کر لئے گئے۔ ہندوارہ سے حاجی عبدالرحیم، غلام قادر مصالحہ، محمد یوسف کنگیل اور مولوی عبدالعزیز کو حراست میں لیا گیا۔

اس ساری صورتِ حال سے متاثر ہو کر اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر کے مولوی محمد سعید مسعودی نے مدرس کی نوکری چھوڑ کر خانقاہ معلیٰ میں سٹیج پر کھڑے ہو کر ڈوگرہ شاہی کو للکارا۔ ایک گھنٹے کی تقریر کے دوران انہوں نے تحریک آزادی کی منظم جدوجہد میں عوام کو ثابت قدم رہنے کے بعد خود کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ اس طرح ڈوگرہ شاہی کے خلاف تحریک آزادی میں ایک اور شخصیت نے اپنا نام درج کرایا۔ یہ مولانا محمد سعید مسعودی تھے۔ ۱۹۳۳ء میں جب بخشی غلام محمد کی قیادت میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف ایک والنٹیر فورس تشکیل دی گئی اور اس کے لئے وردیاں فراہم کی گئیں تو مولانا محمد سعید مسعودی نے اس والنٹیر فورس سے خطاب کر کے سرکار کے لئے ڈیمانڈ کا چارٹر پیش کیا۔ اس پران کے خلاف غلام مصطفٰے اور ینگ عبداللہ کے ساتھ وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں جب شخصی راج کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور لیڈران قوم نے گرفتاریاں دینی شروع کیں تو مولانا مسعودی

نے خانقاہ معلیٰ کے سٹیج پر آکر انسپکٹر جنرل مسٹر پیل سے مخاطب ہو کر کہا اگر شیخ محمد عبداللہ اور دوسرے لیڈروں کو رہا نہ کیا گیا تو ہم گرفتاریاں دینے کے لئے تیار ہیں۔

۱۹۳۲ء سے جب سے مولانا مسعودی سیاسی میدان میں کود پڑے ۱۹۳۸ء تک وہ دوسری صف کے بڑے سرگرم لیڈر رہے۔ ان کی تحریر اور تقریر بڑی مدلل اور موثر ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جب اس تحریک پر حالات کے تھپیڑے پڑے اور مسلم کانفرنس ایک گہری سازش کی شکار ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ کانگریس کے لیڈر جواہر لال نہرو کے جھانسے میں آگئے اور مسلم کانفرنس کو توڑ کر نیشنل کانفرنس بنانے میں جٹ گئے' تو مولانا مسعودی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ البتہ بعض اُمور سے وہ بالکل بے خبر رہے۔ فروری ۱۹۳۹ء میں لدھیانہ پنجاب میں سٹیٹ پیوپلز کانفرنس منعقد ہوئی اس میں شیخ محمد عبداللہ' چوہدری غلام عباس' سردار بدھ سنگھ اور مولانا مسعودی شامل ہوئے۔ یہ مولانا کا پہلا ملکی دورہ تھا۔ اس اجلاس کے مہمان خصوصی پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ کانفرنس کی صدارت شیخ محمد عبداللہ نے کی۔ کشمیری نمائندوں کی طرف سے اس اجلاس میں خطاب مولانا محمد سعید مسعودی نے کیا۔ سامعین کے ساتھ پنڈت نہرو' مولانا مسعودی کی تقریر سے اس قدر محظوظ ہوئے کہ انہوں نے مولانا کو قومی تحریک میں شامل ہونے کی پیشکش کی۔

۱۰ر اور ۱۱ر جون ۱۹۳۹ء کو خواجہ غلام محمد صادق کی صدارت میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کے موقعہ پر مولانا محمد سعید مسعودی نے شیخ عبداللہ کے اس نظریئے کی تائید و حمایت کی کہ اب جبکہ ہماری جدوجہد سے ریاست کے تمام باشندوں کو یکساں فوائد پہنچانا ہے تو کہیں نہ کہیں ہم سب مل کر اس نظریہ' اس نصب العین کے لئے کمربستہ ہو جائیں جس سے ہمارا مستقبل درخشاں بن جائے۔

نیشنل کانفرنس کا مجوزہ آئین کا مسودہ مناسب اضافہ اور ترمیمات کے بعد منظوری کے لئے پیش کیا گیا۔ اگرچہ اس پر خواجہ غلام محمد صادق' بخشی غلام محمد اور مولانا

مسعودی کے دستخط ثبت تھے لیکن نیشنل کانفرنس کا یہ مجوزہ آئین مرتب کرنے میں مولانا کا اہم رول رہا ہے۔

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں مولانا مسعودی کو غلام محمد صادق کے ہمراہ شیخ محمد عبداللہ نے محمد علی جناح کے پاس بھیج دیا۔ لاہور میں صادق صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی تو مسعودی صاحب نواب ممدوٹ کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے جہاں انہوں نے جناح صاحب سے ملاقات کی۔ مولانا مسعودی نے جناح صاحب کو شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ملاقات کی خواہش سنٹرل اسمبلی کے اگلے اجلاس تک ملتوی رکھنے کی تاکید کی جو فروری ۱۹۴۴ء میں دہلی میں ہورہی تھی۔ مولانا مسعودی نے قائداعظم کو کشمیر آنے کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کرلی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا اور ہندوستان کی پہلی اسمبلی بنی تو اس اسمبلی میں کشمیر کی نمائندگی کرنے والے ممبر مولانا محمد سعید مسعودی نامزد ہوئے۔ ان کی تقرری کی سفارش ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے کی تھی۔

شیخ محمد عبداللہ کے بہت قریب رہتے ہوئے بھی مولانا کو نہ کابینہ میں لیا گیا نہ ہی وزارت میں کسی عہدے کی پیشکش کی گئی۔ خود مولانا نے بھی وزارت میں شامل ہونے کی کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ شیخ صاحب کو جب بیرونی ممالک کے دوران چین کے وزیراعظم سے ملاقات کی پاداش میں ان کا پاسپورٹ منسوخ کرکے واپس دہلی آنے کا فیصلہ سنایا گیا تو مولانا محمد سعید نے انہیں دہلی واپس آنے کی بجائے کسی ملک میں پناہ لے کر یہاں سے تحریک آزادی کا مشن چلانے کا مشورہ دیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ نے ان پر الزام لگایا کہ مولانا مسعودی انہیں جلائے وطن کرکے خود ریاست کا لیڈر بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

مولانا مسعودی ایک تاریخ اور ایک تحریک تھے۔ یقیناً ان کا کوئی ثانی نہیں۔ جس عمر میں اور جن حالات میں ان کو گولی کا نشانہ بنایا گیا اس پر سوائے افسوس کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

☆......محمد سعید الرحمٰن شمس

مولانا محمد سعید مسعودی......میری نظر میں

مفکر کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی جموں و کشمیر کی سیاست میں ایک اہم ستون اور بنیادی حیثیت کے مالک تھے۔ آپ انتہائی سادہ مزاج اور متواضع شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت کی چھاپ جموں و کشمیر کی تقریباً سبھی سرکردہ دینی اور سیاسی شخصیات پر واضح طور پر نظر آتی ہے' چاہے شیخ محمد عبداللہ مرحوم ہوں یا میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق ہوں' مرحوم افضل بیگ ہوں یا جماعت اسلامی کے بزرگ رہنما سید علی گیلانی صاحب ہوں' مولانا سید غلام محمد کاملی مرحوم ہوں یا مولانا محمد امین واجدی یا جناب محمد شفیع قریشی ہوں یا مفتی محمد سعید صاحب ہر ایک نے سیاسی نشیب و فراز کے ہر مرحلہ پر مفکر کشمیر سے مشاورت اور ان کی قیمتی آرا سے استفادہ کیا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی سیاست کو صحیح اور مثبت رخ دینے اور عوامی مفاد کے تئیں اصلاحات کرانے میں حقیقتاً مفکر کشمیر مولانا مسعودی کا ایک بنیادی' ناقابلِ فراموش اور گراں قدر رول رہا ہے۔

راقم نے مولانا مسعودی کو پہلی بار مولانا فاروق صاحب کے ساتھ گاندربل میں ان کی رہائش گاہ میں دیکھا۔ اس سے قبل میر واعظ نے راقم سے ایک خصوصی نشست میں کہا اور جس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۸۳ء میں قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے وصال پر احقر نے ایک تاثراتی و تعزیتی طویل مضمون مجلّہ ''نصرۃ الاسلام'' میں شائع کیا۔ یہ مجلّہ جس کے بانی اور سرپرست میر واعظ بذاتِ خود تھے اور ان ہی کی ہدایت پر ریاست اور بیرون ریاست تقریباً تمام اہلِ علم مقتدر

شخصیات اور تعلیمی اداروں کو مجلّہ اعزازی طور بھیجا جاتا تھا۔ رسالہ مولانا مسعودی صاحب کی خدمت میں بھی پہنچا۔ علمی آدمی تو تھے ہی اور پھر جب علامہ قاری طیب صاحب پر مضمون ہوتو دونوں عظیم شخصیات کے مابین جو دیرینہ عملی، فکری اور دینی اٹوٹ رشتے تھے اس کا تقاضا تھا کہ مولانا مسعودی، قاری طیب پر تعزیتی تاثرات ضرور پڑھتے۔

بہر حال اس کے فوراً بعد اسلامیہ کالج سوپور کی سالانہ پُرشکوہ تقریب میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق، جن میں ان دنوں سیاسی اتحاد عمل میں آیا تھا، دونوں فاروق کے علاوہ متعدد اور اہم شخصیات اس عظیم اور تاریخی جلسہ میں موجود تھیں۔ مولانا مسعودی نے بھی خصوصی دعوت پر جلسہ میں شرکت کی تھی۔ اسٹیج پر مولانا مسعودی نے میر واعظ سے مجلّہ کے مدیر یعنی راقم کے بارے میں پوچھا چونکہ اب تک براہِ راست مولانا سے نہ تو ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا اور نہ ہی زیارت کی سعادت ملی تھی۔ بعد میں میر واعظ کشمیر نے مجھ پر انکشاف کیا کہ مولانا مسعودی تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے اور قاری طیب صاحب پر تمہارا مضمون پڑھ کر مولانا بے حد متاثر ہوئے اور مجھے تمہاری دل داری، دل دہی اور خورد نوازی کی تاکید کی۔ راقم نے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ حقیر کاوش کی مولانا مسعودی جیسے دیدہ ور عالم دین نے پذیرائی فرمائی اور سند قبولیت عطا کی۔

اس کے بعد مولانا مسعودی صاحب سے براہ راست ملاقات کا شوق بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ وقت بھی آ گیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قیام کشمیر کے دوران متعدد بار نہ صرف مولانا سے ملاقات اور نیاز حاصل ہوتا رہا بلکہ ہر بار ان کی علمی شخصیت اور قناعت وسادگی سے متاثر ہوتا رہا اور حسبِ توفیق دینی و علمی رہنمائی حاصل کرتا رہا۔

کبھی اُن کی خدمت میں حاضری ہوتی اور کبھی خود میں مولانا مرحوم کی ایما اور

حکم پر درِ دولت پر حاضری دیتا۔ ان ملاقاتوں اور یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اکثر نجی اور ذاتی نوعیت کی ہیں اور جن کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ جہاں تک میں نے مولانا موصوف کو قریب سے دیکھا ہے اور کئی مراحل پر ان کی طویل ترین گفتگو اور خیالات غور سے سنے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ مولانا موصوف اپنے فکر و ذہن اور سوچ کے لحاظ سے اونچے اور بلند مقام پر فائز ہیں جہاں ہر کہہ و مہہ کی فکر کی پرواز ماہ تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور بقول معلم شیرازی شیخ سعدیؒ۔

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی از آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

مولانا موصوف ایک گوہر نایاب اور روشن چراغ تھے، جن کو وہ قدر و منزلت نہیں دی گئی جس کے وہ بجا طور پر مستحق اور حق دار ہیں۔

مفکرِ کشمیر کی سیاسی نظر اور نگاہ بڑی وسیع اور دُور رس تھی۔ اُن کے مدلل اور فکر انگیز خطابات اور بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نہ صرف کشمیر بلکہ عالمِ اسلام اور دنیا بھر میں رونما ہونے والے سیاسی و غیر سیاسی واقعات، انقلابات، مختلف تہذیبوں، مختلف تحریکوں، مادی اور غیر مادی دعوتوں سے اچھی طرح باخبر تھے بلکہ ان پر ناقدانہ نظر اور ہر معاملہ میں اپنی ایک فیصلہ کن رائے رکھتے تھے۔

مولانا مسعودی کا علم تازہ، وسیع اور عمیق تھا۔ مطالعہ کے بے حد شوقین اور کتابوں کے رسیا تھے۔ خالی اوقات میں گھنٹوں یکسوئی کے ساتھ مطالعہ اور تحریر میں وقت گزارتے تھے۔ تقریر انتہائی بلیغ، پُر تکلف اور جامع فرماتے۔ تحریر بے حد چست اور حسین و دلکش ہوتی تھی۔

سیاسی نشیب و فراز اور اس میدانِ خارزار کے گویا ایک ایسے مسافر اور راہ رو تھے کہ ہر ایک سیاسی الجھن کو چٹکی میں سلجھا دینا بس مولانا کا ہی کمال تھا۔

بات سے بات پیدا کرنے اور بال کی کھال نکالنے میں بھی مولانا کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ روزانہ ملنے جلنے والوں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے منصب، مقام اور ذہن وشعور کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔

جموں و کشمیر کی سیاست کے پس منظر میں نئی دہلی کے اربابِ قیادت اور اعلیٰ لیڈروں سے انتہائی قریب اور خوشگوار تعلقات اور طویل مدت تک ممبر پارلیمنٹ رہنے کے باوجود کبھی بھی اپنے عہدے اور منصب کا مولانا مسعودی نے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا۔ حالانکہ اگر چاہتے تو مولانا اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنیاد پر دولت کے انبار جمع کر سکتے تھے اور عام سیاسی لیڈروں کی طرح عیش و آرام کی زندگی گزار سکتے تھے لیکن مولانا نے ایسا نہیں کیا۔ ظاہر ہے اس کی بنیادی وجہ موصوف کی وہ تعلیم و تربیت تھی جو خالص دینی اور اخلاقی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

☆☆☆

☆......اقبال مسعودی

داداجان......میرے مُرشد' میرے رہنما

مرحوم مولانا مسعودی جیسی پُر بہار اور ہمہ جہت شخصیت پر قلم اُٹھانا میرے لئے آسان نہیں۔ آپ کے ساتھ میری کئی ناقابل فراموش یادیں وابستہ ہیں جو میرے شعور پر مرتسم ہوچکی ہیں۔ اُن میں سے خصوصاً ایک ایسا نادر واقعہ جس نے میرے ذہن پر اَن مِٹ نقوش رقم کئے ہیں اور میری زندگی میں انقلاب برپا کر رکھا ہے۔ میری نفسیات میں ہلچل مچادی' عملی زندگی کے تئیں میری سوچ اور رویہ میں یکسر تبدیلی لائی۔ اپنے داداجان کے ریاست کے ایک نامی گرامی اور معروف سیاست دان ہونے کے ناطے میں نے اپنے خوابوں کی نرالی دنیا سجا رکھی تھی۔ برعکس اس کے میں خود محنت اور جدوجہد میں مگن ہوجاتا۔ میری تمام نظریں داداجان پر مرکوز تھیں کہ وہ اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کر کے میری امیدوں اور تمناؤں میں رنگ بھر دیں گے۔ اس نوع کے طرز فکر اور زعم کے حامل انسان کے اندر لازماً عیوب ونقائص جنم لیتے ہیں اور میرے ساتھ بھی بعینہ ایسا ہی معاملہ تھا کہ میں اپنی پڑھائی کی طرف عدم دلچسپی کی وجہ سے اوسط درجے کا طالب علم ثابت ہوگیا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مگن تھا کہ اسی اثناء میں میری ٹیم کے ایک ساتھی کے والد بیچ میدان میں نمودار ہوگئے۔ اپنے بیٹے کو میرے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہوگئے۔ وہ اپنے بیٹے پر ٹوٹ پڑے اور اُسے کھری کھری سناتے ہوئے کہہ اُٹھے کہ ''تیرے اس رئیس زادے کے

ساتھ کھیلنے کی کیا اوقات ہے وہ تو ریاست کے ایک بلند پایہ سیاسی رہنما کا پوتا ہے۔ اُسے کس چیز کا غم ہے وہ کتنا بھی اپنی تعلیم کے حوالے سے بے فکر ہو اُس کے دادا جان تو اُس کے روشن اور محفوظ مستقبل کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں اور کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں"۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اپنی تعلیم کے حوالے سے لاپرواہی برتنے کے نتیجے میں بارہویں جماعت کا امتحان فقط ۵۱ رفیصد نمبرات کے ساتھ پاس کیا تھا۔ پھر بھی میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ خیالوں کی دُنیا میں محل پر محل تعمیر کیے جا رہا تھا اور اپنے دادا جان کی سیاسی پوزیشن اور اثر و رسوخ کے سہارے گورنمنٹ میڈیکل کالج میں اپنی سیٹ یقینی ہونے کے زعمِ ناقص میں سرگرداں تھا۔ بہرحال اسی مدہوشی کے عالم میں جب میں ایک دن دادا جان کے پاس بارہویں جماعت کی مارکس سٹرٹیفکیٹ لے کر حاضر ہوا۔ اس امید کے ساتھ کہ میرے دادا جان رزلٹ کارڈ دیکھ کر مجھے شاباشی دیں گے اور تعریفوں کے پل باندھیں گے۔ مگر یہ ایں خیال است ومحال است وجنون است ثابت ہوگیا۔ میرے نمبرات کی شرح دیکھ کر ایک دم ناک بھوں چڑھالی اور میری خوب خبر لی۔ بارہویں جماعت کی میری کارکردگی کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔ بڑے ہی تُرش لہجے میں متنبہ کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اس بات کی وضاحت بھی کی کہ پہلے اپنی کارکردگی کو بہتر سے بہترین بنالیں اور پھر میرے پاس کسی جائز مدد کے لئے حاضر ہو جائیں۔ دادا جان کے اس سلوک اور طرز عمل نے میری خیالی دُنیا کی کایا پلٹ دی۔ میری آرزوؤں اور تمناؤں کو چکنا چور کر دیا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ دادا جی نے اس بات سے بھی آگاہ کر دیا کہ مجھ جیسے اوسط درجے کے امیدوار کے لئے میڈیکل کالج میں داخلے کی سفارش کر کے وہ اپنے ضمیر کے ساتھ کھلواڑ نہیں کر سکتے ہیں۔ اس موقر ادارہ میں میڈیکل تعلیم کے داخلے کے مستحق صرف اور صرف ذہین، ہونہار اور محنتی امیدوار ہو سکتے ہیں نہ کہ منظورِ نظر اور سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے اُمیدوار۔ ساتھ ہی مجھے واضح

اور سخت ہدایات بھی دی گئیں کہ اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ تعلیم میں منہمک ہو کر خوب سے خوب تر کارکردگی کا مظاہرہ کروں اور تب جا کے کسی مدد کی اُمید اور توقع رکھوں۔ دادا جان نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ صاف الفاظ میں مافی الضمیر کا بے باک اظہار کچھ اس طرح کیا کہ تجھ جیسے نا اہل اور اوسط درجے کے امیدوار کی سفارش کر کے میں انسانی جانوں کو خطرہ میں ڈالنے کی حماقت کبھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک ڈاکٹر کے فرضِ منصبی میں بیماروں کے علاج و معالج کی حساس اور نازک ذمہ داری ہوتی ہے۔ ان ذمہ داریوں کے تئیں تھوڑی سی بھی تساہل پسندی اور لاپرواہی انسانی جانوں کے زیاں کا موجب بن سکتی ہے، اگرچہ دادا جان کی اس اصول پسندی اور صاف گوئی سے درونِ دل میں مضمحل ہو گیا لیکن زندگی میں پہلی بار میں نے تہیہ کر لیا کہ میں آئندہ کسی کے بل اور سہارے پر کچھ حاصل کرنے کی بجائے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے لئے جی توڑ محنت سے کام لوں گا۔

اس واقعہ نے میری طرز فکر کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا اور میں نے چیزوں اور واقعات کو خیالی اور رومانی انداز کے برعکس صحیح، واقعی اور حقیقی پیرایہ میں دیکھنے کا گر سیکھ لیا۔ دوسروں پر تکیہ کرنے کے خواب و خیال کے بدلے مجھ میں خود اعتمادی اور اپنی محنت کے بل پر کچھ کر دکھانے کا عزم اور ارادہ پیدا ہو گیا۔ مولانا نے مجھے ڈاکٹری سیٹ حاصل کرنے میں کوئی مدد تو نہیں کی لیکن میری خوابیدہ صلاحیتوں اور استعداد کو بیدار کر دیا۔ میری قوت ارادہ اور جذبۂ خودی کو جلا بخشی۔ میرے عزائم میں اعتماد اور سلیقہ مندی کا عنصر پیدا کر دیا۔ سب سے بڑھ کر میرے اندر عزتِ نفس اور غیرت مندی کی حس بیدار کر دی۔ شاید ہی میری زندگی میں اس قدر تبدیلی واقع ہوتی اگر مولانا نے مجھے بروقت جھنجھوڑا نہیں ہوتا اور میرے قلب وضمیر میں یہ خوشگوار انقلاب برپا نہیں کیا ہوتا۔ اگر دادا جان مرحوم نے مجھ میں پائے جانے والے مرض کی تشخیص صحیح وقت پر نہ کی ہوتی تو آج

میری حالت بد سے بدتر ہوئی ہوتی اور میں غفلت شعاری، تساہل پسندی اور ناہنجاری کے بھنوروں میں ہی زندگی بھر ہچکولے کھاتا رہتا۔ انہوں نے میری سرزنش کر کے مجھے زندگی کی وہ منزل پانے کا حوصلہ بخشا۔

داداجان کی ذات اوران کے کردار وتربیت کا ہی پیش خیمہ ہے جو کچھ بھی مجھے حاصل ہوا ہے اس کے لئے میں داداجان کی ذات کا ہی مرہونِ منت ہوں۔ میری ہر سانس اُن کے لئے دُعا گو ہے اور داداجان کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمتِ خاص سے نوازے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

☆☆☆

Urdu SHEERAZA

Maulana Masoodi Number

Volume: 55

Number: 01



Chief Editor:
M. Ashraf Tak

Published by:
J&K Academy of Art, Culture and Languages

Urdu SHEERAZA

Maulana Masoodi Number

Volume: 55

Number: 01



Chief Editor:
M. Ashraf Tak

Published by:
J&K Academy of Art, Culture and Languages